جنوبی ہند میں اردو

عشرت پبلشنگ ہاؤس
متصل لائن پریس عقب بان والی گلی
ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

جنوبی ہند میں

اُردو

پیا م شاہجہانپوری

عشرت پبلشنگ ہاؤس عقب پان والی گلی ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

انتساب

سید فیاض علی صاحب ایڈووکیٹ جنرل آف

پاکستان

کے نام

اُن کے خلوص، اُن کی سخن فہمی، اُن کی ادب نوازی اور اُس نوازش سے متاثر ہو کر جو موصوف میرے حال پر فرماتے ہیں۔

نیاز گذار

پیام شاہجہانپوری

فہرستِ مضامین

سرِ آغاز

جس موضوع پر یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ نیا نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلے کی بہت سی کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ مگر اُن نگارشات میں جنوبی ہند کی اردو کے کسی ایک یا چند پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جس میں پورے جنوبی ہند کی داستانِ اُردو بیان کی گئی ہو۔

زیرِ نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے وہ تمام علاقے شامل کر لئے جائیں جہاں اُردو کا ذرا سا بھی نشان مل سکے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کتاب میں صرف گولکنڈہ و بیجاپور یا موجودہ حیدرآباد ہی کی اُردو پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ مدراس، میسور اور اُن کے ملحقات تک کو شامل کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر پہلو پر کم سے کم صفحات میں روشنی ڈال دی جائے۔ کیونکہ ادب و تنقید کی ضخیم کتابیں پڑھتے ہوئے قاری اُکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ یوں بھی موجودہ دور میں انسانی مصروفیات بہت بڑی ہوئی ہیں۔ اور پھر قوتِ خرید بھی بہت کم ہے۔

میں نے یہ التزام بھی کیا ہے کہ ہر دور کی اُردو کے ارتقا کی داستان بیان کرنے سے پہلے اُس دور کے تاریخی پس منظر پر بھی روشنی ڈال دی جائے تاکہ اُردو کے ارتقا کے اسباب و علل بھی سامنے آجائیں۔

اب تک اس موضوع پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں وہ صرف تذکروں تک محدود ہیں۔ میں نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر تذکرے کے ساتھ ساتھ اس میں تنقید و تبصرہ بھی شامل کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطالعہ کے وقت اندازہ ہوگا کہ تمام قابلِ ذکر شاعروں اور نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج، رجحانات

شاعری اور ادبی شہ پاروں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے اور جگہ جگہ تجزیہ کر کے دکھایا گیا ہے اور مختلف ادوار کی اردو نثر پر عمومی تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ مختلف تذکروں کے مطالعہ کے وقت جہاں جہاں میری ناچیز رائے نے دوسرے مصنفین سے اختلاف کیا ہے وہاں وہاں میں نے بڑی دیانت داری سے دلائل کی روشنی میں اپنا نقطۂ نگاہ واضح کر دیا ہے۔ اس سے میرا مقصد کسی کی تنقیص یا عیب جوئی کرنا نہیں تھا۔ مدعا صرف یہ تھا کہ میری دانست اور مقدور کے مطابق جنوبی ہند میں اردو کی تاریخ کا ہر پہلو اغلاط سے پاک ہو۔

یہ میری چھٹی کتاب ہے جو اس ادارے سے شائع ہو رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح قارئین نے میری پہلی کتابیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی تھیں اسی طرح اسے بھی قدر دانی کے ہاتھوں سے لیں گے اور اگر کسی جگہ کوئی خامی پائیں گے تو مجھے اس سے مطلع کریں گے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں تبدیلی کر سکوں۔

پیام شاہجہانپوری

ایڈیٹر ویکلی "حمایت اسلام" لاہور

۱۴ جولائی ۱۹۵۵ء

لاہور آرٹ پریس بالمقابل گنپت روڈ انار کلی لاہور۔

اُردو کا ابتدائی دور

اُردو سے پہلے ہندوستان ہمیشہ ایک قوم کا مسکن نہیں رہا۔ یہاں مختلف زمانوں میں مختلف قومیں آتی رہیں اور یہاں کے قدیم باشندوں کو مغلوب کر کے اپنی تہذیب و تمدن، اپنے مذہب اور اپنی زبان کا سکّہ چلاتی رہیں۔

تاریخ جانتی ہے کہ ہندوستان کی قدیم نسل دراوڑ تھی۔ آریوں نے اس قدیم نسل کو شکست دے کر جنوبی ہند کی طرف دھکیل دیا اور خود شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ ان کی زبان سنسکرت ہندوستان کی زبان قرار پائی۔ سنسکرت کا آفتاب مدت ہا مدت تک ہندوستان پر ضو فگن رہا لیکن عوام کی زبان یا بول چال کی زبان بحیثیت مجموعی وہی رہی جو آریوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مستعمل تھی۔ یعنی "پراکرت"۔

پراکرت کے ماخذ، اُس کی ابتدا اور ارتقاء، خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر ایک بات تو مسلم ہے اور وہ یہ کہ آریوں کے تسلط سے پہلے پراکرت ہی ہندوستان کے عوام کی زبان تھی اور پھر یہی وہ زبان ہے جو بدھ اور جین کی مذہبی زبان کہلاتی ہے اور بدھوں کے زمانۂ حکومت میں یہی زبان ہندوستان پر حکومت کرتی تھی۔

اُردو کی اصل آریوں نے اپنی زبان سنسکرت کو رواج دینے کی پوری کوشش کی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے عوام کی زبان پراکرت ہی رہی۔

پراکرت کی بہت سی شاخیں تھیں۔ ان میں سے پانچ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔
۱۔ پالی ۲۔ جینا پراکرت ۳۔ مہاراشٹری ۴۔ مگدھی ۵۔ سوراسینی۔[1]

ان میں سے سوراسینی زبان بولنے والوں کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع تھا۔ یہ زبان علاقۂ برج (متھرا) میں بولی جاتی تھی۔ اسی لئے اسے "برج بھاشا" بھی کہتے تھے۔ یہی برج بھاشا اُردو زبان کی اصل قرار دی جاتی ہے۔ کیوں؟

"زبان[2] کی تشخیص و تمیز کا اصول یہ ہے کہ کسی مخلوط زبان میں جس زبان کے افعال و ضمائر و متعلقات فعل کا غلبہ ہوتا ہے وہی زبان اس مخلوط زبان کی اصل و ماخذ قرار دی جاتی ہے۔ اُردو زبان میں مذکورہ بالا اجزاء برج بھاشا کے ہیں اس لئے برج بھاشا اُردو کی ماں ہے"۔

اس واضح اور صحیح ترین اصول کے بعد یہ مسئلہ تو طے ہو جاتا ہے کہ اُردو کی اصل برج بھاشا ہے۔

اُردو کی ابتدا جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اُن کے بہت سے خاندان یہاں مستقل طور سے مقیم ہو گئے تو ان کے اور ہندوستان کے اصل باشندوں کے اختلاط سے زبانیں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کی زبان جس میں عربی، فارسی، پشتو اور ترکی کے الفاظ شامل تھے مقامی زبان پراکرت اور خاص طور سے برج بھاشا کے ساتھ مل کر رفتہ رفتہ ایک نئی صورت اختیار کر گئی۔ اسی کی ترقی یافتہ صورت کا نام اُردو ہے۔

لفظِ اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور لشکر گاہ کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ اکبر[3] کے زمانے سے شاہی لشکر اور دارالحکومت کے لشکرگاہ کو اُردوئے معلّٰی کہا کرتے

---

[1] اردوئے قدیم صہ ۱ مصنفہ حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری [2] داستان تاریخ اُردو صہ مصنفہ حامد حسن قادری۔ [3] اُردوئے قدیم صہ

تھے اور اُس کا بازار اُردو بازار کہلاتا تھا۔ اُردو عام طور پر مغلیہ اُردو لشکر گاہوں میں بولی جاتی تھی جس کے باعث اس کا نام زبانِ اُردو یعنی اہلِ لشکر کی زبان شہرت پایا اور بعد میں کثرتِ استعمال سے لفظِ زبان حذف ہو گیا اور عام طور پر اُردو کہنے لگے۔" بلکہ اگر ہم تلاش و تحقیق کی کٹھن وادی کا سفر برداشت کر سکیں تو "داستانِ تاریخِ اُردو" کے مصنف کے بقول شہنشاہ بابر کے فرمانوں میں بھی لشکر اور لشکر گاہ کے لئے اُردو کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بلکہ بابر کے سکوں پر بھی اُردو کا لفظ کندہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ انکشاف بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ آج سے سو سال پہلے مغل شہنشاہ بابر نے اُس وقت کی زبان میں ایک شعر بھی کہا تھا۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی [1] — مجھ کو / یاقوت
فقرا ہلیغہ بس بولغو سیدر پانی وروتی — ردی

ہندی زبان مغل شہنشاہ بابر اور اکبر ہوں یا "تاریخ جہاں کشائے" کے مصنف علاء الدین بن عطا، اس میں شک نہیں کہ اُن کے زمانے تک اُردو کا لفظ لشکر اور لشکر گاہ کے لئے ضرور استعمال ہوتا تھا۔ مگر یہ کہنا غلط ہے کہ اس زمانے میں لشکریوں کی زبان کے لئے بھی اُردو کا لفظ بولا جاتا تھا۔ بلکہ قدیم تصانیف شاہد ہیں کہ اُسی زمانے میں بولی جانے والی زبان اُردو نہیں "ہندی" کہلاتی تھی۔ اور تو اور امیر خسرو تک نے اپنی اُردو شاعری کو "کلامِ ہندوی" کہا ہے۔

زبان پر عمومی تبصرہ ہندوستان کی عنانِ حکومت سنبھالنے سے پہلے بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ان کے تجارتی قافلے سمندر کے راستے جنوبی ہند کے ساحلوں سے گزرتے رہتے تھے۔ خود ہندوستان

---

[1] داستانِ اُردو صفحہ ۴۸

سے بھی ان کی تجارت ہوتی تھی اور وہ مدراس و بمبئی کے ساحلوں پر اُترتے رہتے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ گفتگو اور تبادلۂ خیالات کے لئے، حساب کتاب اور لین دین کے معاملات طے کرنے کے لئے اُنھیں ایک دوسرے کی زبانیں سیکھنی اور بولنی پڑتی ہوں گی۔ چنانچہ عرب جنوبی ہند میں بولی جانے والی زبانوں کے الفاظ اور جنوبی ہند کے لوگ عربی زبان کے الفاظ سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ رفتہ رفتہ ان کی زبانوں میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب اُمڈا اور اُن کے گھوڑے خشکی و تری کو پامال کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہو گئے تو وہ جس جس حصے میں گئے اپنی تہذیب و تمدن، رسوم و رواج، زبان اور انتہا یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے اثرات بھی چھوڑتے گئے۔ مگر یہ معاملہ یک طرفہ نہیں تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ جس طرح ہندوستان کی مختلف اقوام نے مسلمانوں کی رسوم و رواج اور تہذیب و تمدن سے اثر قبول کیا۔ اسی طرح ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج سے مسلمان بھی اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے۔ بالکل یہی حال زبان کا تھا۔

ہندوستانی اقوام نے فاتح قوموں سے تعلق بڑھانے، اُن سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے اور امورِ سلطنت میں دخیل ہونے کی غرض سے اُن کی زبان سیکھی۔ مگر یہ صورت دفتری امور اور درباروں تک تو قائم رہی لیکن فاتح قوم کے وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد جو مختلف اوقات میں آ کر یہاں آباد ہوتے رہے۔ اپنی زبان کو مقامی باشندوں پر مکمل صورت میں مسلط نہیں کر سکے۔ یوں بھی اُن کی تعداد کم تھی، وہ اجنبی تھے۔ پھر اس مسئلے کا یہ اہم ترین پہلو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان کی مقامی آبادی کا وہ حصہ جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا، یہیں کی زبانیں بولتا تھا۔ ان نومسلموں

اور بیرونی مسلمانوں کے درمیان بیحد خلوص اور یگانگت کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔
اس باہمی ارتباط نے بھی ہندوستان کی مقامی زبانوں کو عربی و فارسی اور پشتو و ترکی زبانوں سے اثر قبول کرنے پر مجبور کیا۔ مگر اسی قدر کہ نہ تو وہ بالکل عربی و فارسی اور ترکی و پشتو بن سکیں اور نہ اپنی اصلی حالت میں رہیں بلکہ رفتہ رفتہ ایک نئی صورت اختیار کرتی رہیں جس نے ارتقائی منازل سے گذر کر موجودہ شکل اختیار کر لی۔

قیاس چاہتا ہے کہ نو وارد مسلمانوں کو ہندوستان کے مقامی باشندوں سے ملنے جلنے، اُن کے خیالات سمجھنے اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے ... کچھ الفاظ مقامی زبانوں سے لینے پڑے ہوں گے اور کچھ انھیں دینے پڑیں گے۔ اس طرح ایک نئی زبان عالم وجود میں آئی ہوگی۔ اُردو زبان میں عربی، فارسی، پشتو، ترکی، سنسکرت اور پراکرت وغیرہ کی آمیزش اس خیال کی تائید کرتی ہے۔

جنوبی ہند میں اردو

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تصریح کی جا چکی ہے کہ سندھ اور ہندوستان کا جنوبی ساحلی علاقہ ہی ایسا علاقہ تھا جہاں مسلمانوں کی آمد و رفت اس وقت سے شروع ہو چکی تھی جب انھوں نے ہندوستان پر حملہ بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے یہ کہنا بعید از قیاس نہیں ہے کہ ان علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں سب سے پہلے مسلمانوں کی زبانوں سے متاثر ہوئی ہوں گی۔

سنہ ۱۳۰۱ء میں سلطان علاء الدین خلجی کی فوجوں نے جنوبی ہند کی طرف پیش قدمی کی اور راس کماری کے آخری نقطہ رامیشورم تک اسلامی حکومت کا پرچم لہرا دیا۔ اُس وقت تک اہل دکن جو دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے تامل، تلگو زبانیں بولتے تھے۔ علاء الدین کے حملے کے بعد مسلمان پہلی مرتبہ جنوبی ہند میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ اس کے بعد اس علاقے میں شمالی ہند کے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ بلکہ علاء الدین کے حملے کے

بعد مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد جنوبی ہند میں آباد ہوگئی۔ اور اہلِ دکن یا جنوبی ہند کے لوگ مسلمانوں اور شمالی ہند کے لوگوں کی زبان سے پوری طرح آشنا ہوگئے۔ ایک ساتھ رہنے بسنے سے مسلمانوں اور شمالی ہند کے لوگوں کی زبان جنوبی ہند کے لوگوں کی زبان میں مخلوط ہو کر ایک نئی زبان کی شکل اختیار کرنے لگی۔

سنہ ۱۳۶۱ء میں سلطان محمد تغلق نے بھی جنوبی ہند کی طرف پیش قدمی کی اور گجرات و میسور کے دارالسلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اُس کے بعد جب اُس نے (عارضی طور پر) دلی کی بجائے دیوگری (واقع دکن) کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تو سرکاری دفاتر، دربار، اہلِ دربار اور متعلقین کی بہت بڑی تعداد دلی سے نقل مکانی کر کے دیوگری میں آباد ہوگئی۔

دکھنی اُردو

اس طرح مسلمانوں کی آمد و رفت اور ان کے قیامِ دکن نے اہلِ دکن کی زبان پر ایک مستقل اثر قائم کردیا۔ اور تامل تلگو زبانیں شمالی ہند کے لوگوں کی زبان برج بھاشا اور عربی و فارسی اور ترکی و پشتو بولنے والے مسلمانوں کی زبان سے نہ صرف متاثر ہوئیں بلکہ رفتہ رفتہ ایک مستقل زبان کی صورت اختیار کرگئیں، جسے "دکھنی اُردو" کہتے ہیں۔ دکھنی اُردو نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ یہی زبان جنوبی ہند میں تالیف و تصنیف اور شعر و ادب کی زبان قرار پائی۔

اُس زمانے میں دکھنی اُردو کا اسلوب کیا تھا۔ اس کے لئے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے۔ موصوف سنہ ۸۲۵ھ میں فوت ہوئے تھے۔

"بھوکوں[1] موئے سوں خدا اپڑتا ہے — خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہورہے"

---

[1] "عشق نامہ" مصنفہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بحوالہ "اُردوئے قدیم" ص ۲۲

یعنی خدا سے ملنے یا خدا کا عرفان حاصل کرنے کے لئے فاقہ کشی کرنا یا فاقہ کشی کرتے ہوئے مرجانا لاحاصل ہے۔ اس طرح خدا نہیں ملتا ہے۔ اسے پانے کے طریقے کچھ اور ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے تقریباً پونے دوسو برس بعد جنوبی ہند کے خطۂ گجرات میں ایک عالم گذرے ہیں جن کا نام شیخ وجیہہ الدین علوی تھا۔ شیخ موصوف ۹۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۹۸ھ میں فوت ہوئے۔ شیخ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ذیل میں اُن کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں جو دکھنی اُردو میں ہیں تاکہ اُس دور کی دکھنی اُردو کا اندازہ کیا جا سکے۔

"جب[1] ترقی بکڑیں گے تب آپیں درس کہیں گے۔"

"عارف اُسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے۔"

"اگر کسی کوں تھوڑی بھی صفا ہووے، جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام فعل کرتے تو تیسج پاوے۔ دوجے بار بھی پاوے۔ تیجے بار بھی پاوے۔"

---

[1] "بحرالحقائق" بحوالہ "اُردوئے قدیم" صفحہ ۲۱

سلطنت بہمنی

اور اُردو

اس کتاب کے گذشتہ صفحات میں کسی جگہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ علاءالدین خلجی سے پہلے دکن اسلامی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔ سلطان علاءالدین خلجی اور اُس کے جرنیل ملک کافور نے جنوبی ہند کے وسیع و عریض علاقوں پر حملہ کر کے انھیں فتح کر لیا، مگر یہاں کے ہندو حکمرانوں کو تخت سے معزول نہیں کیا بلکہ اپنا باج گزار بنا لیا۔ یہ واقعات ۶۹۴ھ اور ۷۱۲ھ کے درمیان پیش آئے۔

محمد تغلق۔ دکن کی طرف

۷۲۱ھ سے کچھ پہلے خاندانِ خلجی کا چراغ گل ہو گیا۔ اور خاندان تغلق سرِ اَرائے حکومت ہوا۔ خاندانِ تغلق کا پہلا بادشاہ غازی خاں تغلق تھا۔ جو غیاث الدین تغلق کے لقب سے بادشاہ ہوا۔ تغلق خاندان کا مشہور بادشاہ محمد تغلق اسی غیاث الدین کا بیٹا تھا۔

جب حکومت ایک خاندان کے قبضے سے نکل کر دوسرے خاندان کے پاس جاتی ہے تو سرداران حکومت اور باج گذار ریاستیں سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ چونکہ اس انقلاب سے نظم و نسق کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ فوجی قوت بھی زائل ہو جاتی ہے۔ ملکی اور قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ نئے حاکم کے لئے مختلف قسم کی مشکلات ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ سردار یا باج گذار والیانِ ریاست جنھوں نے پہلے خاندان کی طاقت اور سطوت و شوکت سے مغلوب یا مرعوب ہو کر سرِ اطاعت خم کر دیا تھا اس.... انقلاب سے فائدہ اُٹھا کر اور نئے حاکم کے لئے نئی نئی مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے سرکشی اور بغاوت پر اُتر آتے ہیں۔

بالکل یہی صورت خاندانِ تغلق کے ساتھ پیش آئی۔ جنوبی ہند کے مختلف راجہ باغی ہو گئے۔ بعض راجاؤں نے خراج ادا کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا۔ ان حالات میں محمد تغلق کے لئے بڑی مشکلات تھیں۔ مگر اس نے ہمت سے کام لے کر بغاوتوں کو فرد کر دیا۔ چونکہ وہ سارے ہندوستان کو مکمل اور مستقل طور پر اپنے زیر نگیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لئے اس نے دہلی کی بجائے دیوگری (واقع دکن) کو دولت آباد کا نام دے کر اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اس لئے کہ دولت آباد دلی کے مقابلے میں ہندوستان کے وسط میں واقع تھا اور محمد تغلق کسی وسطی مقام کو اپنا دارالسلطنت بنانا چاہتا تھا۔ جہاں سے پورے ہندوستان پر بآسانی حکومت کی جا سکے۔ اور بوقت ضرورت ہندوستان کے ہر علاقے میں فوج بھیجی جا سکے۔ دوسرے، دکن کی بغاوتیں اور شورشیں بھی دبی رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محمد تغلق کا یہ اقدام دکن میں وقتی امن و امان کا باعث ضرور ثابت ہوا۔ مگر اس کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ہندوستان میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ آخر کار محمد تغلق نے اپنے پہلے فیصلہ میں تبدیلی کی اور دولت آباد کی جگہ پھر دلی کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ مگر محمد تغلق کے دولت آباد سے جاتے ہی دکن کے راجہ پھر بغاوت اور شورش پر اتر آئے۔ اور رفتہ رفتہ سارا جنوبی ہند بغاوت کر کے آزاد و خود مختار ہو گیا۔ صرف دولت آباد محمد تغلق کے قبضے میں رہا۔ یہ دیکھ کر سلطان تغلق پھر تسخیر دکن کے لئے روانہ ہوا مگر اسی دوران میں بیدر اور گلبرگہ میں نصرت خاں اور علی شاہ نے علم ہائے بغاوت بلند کر دیے۔ یہ بغاوت اس وقت تو دبا دی گئی مگر وہ بھی حکمت عملی سے۔ سلطان تغلق امیرانِ صدہ سے بہت تنگ آ چکا تھا کیونکہ یہ لوگ موقع ملتے ہی سر اٹھاتے تھے اور محمد تغلق کے لئے وبالِ جان بن جاتے تھے۔ آخر اس

نے ارادہ کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اپنے اسی ارادہ کی تکمیل کے لئے اُس نے دکن کے سپہ سالار کو حکم بھیجا کہ امیرانِ صدہ کو میرے پاس بھیجدیا جائے۔ سلطان کے حکم کی تعمیل بھی ہو گئی۔ اور امیرانِ صدہ سلطان کی جائے قیام کی طرف روانہ بھی ہو گئے۔ مگر چونکہ سلطان اپنی بدمزاجی اور سخت گیری کے لئے مشہور تھا اس لئے راستہ میں امیرانِ صدہ کو خیال ہوا کہ معلوم نہیں سلطان کے سامنے جا کر کیا صورت پیش آئے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی جانوں ہی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ اس لئے ان سب نے مشورہ کر کے سلطان محمد تغلق کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور دولت آباد جا کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چند روز کے بعد قلعہ فتح ہو گیا اور جو خزانہ ہاتھ آیا اسے سب سرداروں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اسماعیل منخ کو ناصر الدین کا خطاب دے کر بادشاہ بنا لیا اور جاگیر بھی آپس میں بانٹ لیں۔

حسن بہمنی

انھیں سرداروں میں حسن خاں بھی تھا جسے بہت سے پرگنے اور ظفر خاں کا خطاب دیا گیا۔ حسن خاں نے ۷۴۸ھ ۱۳۴۷ء میں گلبرگہ کے راجہ پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور خود گلبرگہ پر قابض ہو گیا۔

آخر محمد تغلق اس سیلاب بغاوت کو روکنے لئے بڑھا مگر اب یہ اس کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔ جب اُس نے دولت آباد پر حملہ کر کے نئے حاکم اسماعیل منخ کو شکست دی تو گجرات میں بغاوت ہو گئی۔ سلطان گجرات روانہ ہوا تو حسن خاں نے بیدر پر حملہ بول دیا اور سلطانی فوج کو شکست دے کر اُس کے سپہ سالار عماد الملک کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ اسماعیل منخ کی امداد کے لئے دولت آباد کی طرف روانہ ہوا۔ حسن کی آمد کی خبر سن کر سلطان تغلق کی فوج اور اُس کے سردار جو قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کئے پڑے تھے بھاگ کھڑے ہوئے۔

حسن کی ہمت و شجاعت اور اُس کا رعب و دبدبہ دیکھ کر اسماعیل اس کے

حق میں تختِ سلطنت سے دست بردار ہوگیا۔ ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں دولت آباد کی مسجد میں حسن کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا۔ حسن آباد (گلبرگہ) کو اُس نے اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہی حسن تاریخ میں حسن گنگو بہمنی کے نام سے مشہور ہے اور اُسی کو سلطنتِ بہمنی کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

سلطنتِ بہمنی کا خاتمہ

بہمنی سلطنت کے اقتدار کا سورج کم و بیش پونے دو سو سال ضو فگن رہا۔ اس خاندان میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے۔ آخری بادشاہ کا نام کلیم اللہ بہمنی تھا۔ مگر یہ محض نام کا بادشاہ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں مغل فاتح بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر کے حملہ کی خبر سُن کر کلیم اللہ نے اسے ایک خط لکھا کہ میرے نمک حرام سرداروں اور ارکانِ سلطنت نے خود سلطنت پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے اسیری کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا ہے اگر آپ آ کر مجھے اس قید سے نجات دلوائیں تو میں برار اور دولت آباد کے علاقے آپ کی نذر کر دوں گا۔ کہتے ہیں کہ بہمنی سرداروں کو کلیم اللہ کے اس خط کا علم ہوگیا اور کلیم اللہ اس ڈر سے کہ بہمنی سردار مجھے قتل نہ کر دیں ۹۳۴ھ میں بیدر سے فرار ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد بعض لوگوں کے خیال میں زہر کے نتیجے میں اور بعض کے خیال میں طبعی موت سے فوت ہوگیا۔[1]

عہدِ بہمنیہ پر ایک سرسری تبصرہ

خاندانِ بہمنی کی پونے دو سو سال کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور مسلمانانِ دکن کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی دور میں سلاطینِ بہمنیہ نے فتوحات کا دائرہ بھی وسیع کیا تھا۔ قرب و جوار کی سرکش ہندو ریاستوں کی بھی

۱؎ سلطنتِ بہمنیہ کے قیام اور اس کے پس منظر کے حالات قلم بند کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ "سلطان احمد شاہ بہمنی" مصنفہ مولوی ظہیر الدین ایم۔ اے۔ "تاریخ فرشتہ" جلد سوم مصنفہ حکیم محمد قاسم فرشتہ۔ "تاریخ ہندوستان" مصنفہ شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ۔

گوشمالی کی۔ انھیں بار بار شکستیں دیں۔ اس خاندان میں بڑے بڑے الوالعزم اور باہمت بادشاہ پیدا ہوئے۔ جنگ کے ساتھ ساتھ امن و امان کے دور بھی گذرے خزانے مال و دولت اور زر و جواہر سے بھرے رہتے تھے۔ عوام بادشاہوں پر اپنی جانیں فدا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ فوج بڑی بہادر تھی امرا و سردار بڑے عالی ہمت تھے۔

فنونِ لطیفہ

اس عہد میں فنونِ لطیفہ کی بھی سرپرستی کی گئی۔ فنِ تعمیر نے حیرت انگیز ترقی کی۔ مصنف "سلطان احمد شاہ بہمنی" کے بقول "دکن جب تک خاندانِ خلجی اور تغلق کے ماتحت رہا اس کے فنِ تعمیر میں ان ہی کی نقل کی جاتی تھی۔ اور ان ہی کے وضع کی عمارتیں تعمیر ہوا کرتی تھیں۔ محمد تغلق کے ہاتھ سے جب دکن نکل گیا اور خود مختار سلطنت بہمنیہ قائم ہو گئی تو حسن نے خاندانِ خلجی اور تغلق کے فنِ تعمیر کی نقل کرنے کی بجائے دکن کی مقامی خصوصیات کو ..... برقرار رکھا اور اپنے اثر اور اپنی فاتحانہ شان کو اس میں شامل کر کے ایک جدید طرز پیدا کی جو بہمنی طرزِ تعمیر کے نام سے ہندوستان میں مشہور ہوئی۔ ان کے فنِ تعمیر میں آرائش اور جمالیاتی عنصر پایا جاتا ہے"۔ غرض یہ کہ اس دور کا فنِ تعمیر بہت ترقی یافتہ اور جدت و اختراع کا بہت خوبصورت نمونہ کہلانے کا مستحق ہے۔ مستحکم قلعے اور برج، پرشکوہ محلات۔ عالیشان مسجدیں اور گنبد، خوشنما اور باوقار دروازے ... مختلف عمارات اور کی نقاشی سلاطین بہمنیہ کی خوش مذاقی اور فنونِ لطیفہ سے خصوصی تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔

اہلِ کمال کی قدر افزائی

خاندانِ بہمنیہ کا دورِ حکومت اس اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس عہد میں صوفیا، علما و فضلا اور شعرا کی بہت قدر افزائی کی گئی۔ خاص طور پر خاندانِ بہمنیہ کا نیک دل اور جلیل القدر سلطان احمد شاہ ولی بہمنی اس اعتبار سے اپنے پیش رووں میں سب سے آگے تھا۔ مشہور بزرگ حضرت خواجہ ... بندہ نواز گیسو دراز سلطان فیروز شاہ بہمنی کے ہی عہدِ حکومت

یں ولی کی طرف سے دکن تشریف لائے۔ فیروز شاہ نے خواجہ صاحب کی بڑی قدر و منزلت کی۔ فیروز شاہ کے انتقال کے بعد جب سلطان احمد شاہ بہمنی بادشاہ ہوا تو اُس نے خواجہ صاحب کے اعزاز و اکرام میں اور بھی اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ بعض اور علما و صوفیاء اور بزرگانِ دین نے بھی سلاطین بہمنی کے عہدِ اقتدار میں سرزمین دکن میں نہایت آرام و آسائش اور عزت کی زندگی گذاری۔

سلاطین بہمنیہ کی قدر و منزلت اور علم پروری کی داستانیں سن سن کر غیر ممالک کے علماء، فضلاء، اور شعراء و ادباء نے بھی دکن کا رُخ کیا۔ ملک الشعراء شیخ آذری، ملا احمد قزوینی، میر ابوالقاسم جرجانی، مولانا نجم الدین اور مولانا ابو احمد مقبول جیسے باکمال شاعر اور علماء بیدر میں جمع ہو گئے تھے۔

خود بہمنی سلطانوں میں سے بعض میں شعر و ادب کا بڑا اچھا مذاق تھا۔ چنانچہ سلطان فیروز شاہ بہمنی ۸۰۰ھ تا ۸۲۵ھ نہ صرف علم و فضل میں منتہائے کمال پر پہونچا ہوا تھا بلکہ شاعر بھی تھا اور عروجی و فیروزی تخلص کرتا تھا۔ اسی خاندان کا ایک سلطان محمد شاہ ثانی شعر و ادب کا اس قدر دلدادہ او اہلِ کمال کا اتنا قدر دان تھا کہ اُس نے حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی۔ اور جب حافظ نے بحری سفر سے گھبرا کر معذرت کی تو اُس نے حافظ کو ایک ہزار طلائی سکّے بھجوا کر اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا۔

عہدِ بہمنیہ میں دکھنی نثر "معراج العاشقین"

صفحات گذشتہ میں سلطنتِ بہمنیہ کے تاریخی حالات اور اُس کے قیام کے پس منظر پر ایک سرسری سا تبصرہ کیا گیا ہے تاکہ اُس خاندان کا ایک ہلکا سا خاکہ نظر کے سامنے آسکے جس کے عہدِ اقتدار میں اُردو، تقریر کی حدود سے نکل کر تحریر کے

---

۱ "سلطان احمد شاہ ولی بہمنی" مصنفہ مولوی ظہیر الدین ایم اے۔

میدان میں گامزن ہوئی۔ اب اس عہد کی نثر و نظم کے کچھ نمونے درج کئے جاتے ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف "معراج العاشقین" کو دکھنی اردو کی سب سے قدیم تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب سے پہلے ایک اور بزرگ شیخ عین الدین گنج العلم نے بھی دکھنی اردو میں چند رسالے لکھے تھے مگر اب یہ ناپید ہیں اس لیئے ان پر کوئی محاکمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے صرف "معراج العاشقین" ہی وہ کتاب ہے جو دکھنی اردو کی سب سے قدیم کتاب کہلانے کی مستحق ہے۔ ذیل میں اس کتاب سے دو اقتباس نقل کئے جاتے ہیں۔

"اے عزیز! اللہ بندہ پناہ یہاں پہچان کو جانا نین تو شروع جاتا ہے۔ اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا"

"انسان کے بوجنے کوں پانچ تن ہے، ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امارہ، یعنی واجب الوجود کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حسد تک سوں بو بوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ کرنا سو۔ کفیا کی شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پہچان دوا دینا۔"

"معراج نامہ" خواجہ صاحب کی تصانیف میں "معراج نامہ" اور "سہ بارہ" نامی رسالے بھی شامل ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بھی چند چند سطور نقل کی جاتی ہیں تاکہ ان کی مختلف تحریروں کا مطالعہ کرکے کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

"تحقیق خدا کے وہ مباتے ستر ہزار پردے ادجیالے کے ہور اندھارے کے اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جائے تو اُس کی آنچہ تے میں جلوں"۔

سہ بارہ

سوال:- ایمان کی جھاڑوں کیا اور ایمان کی ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات کیا اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان کا سر کیا اور ایمان کا جیو کیا" (؟)

جواب:- ایمان کا جیو قرآن۔ ایمان کی جڑ توبہ۔ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی۔ ایمان کی پات پرہیزگاری۔ ایمان کا تخم علم۔ ایمان کا پوست سو شرم۔ ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے"۔

عہد بہمنیہ میں دکھنی نظم

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز صرف نثر نگار ہی نہیں تھے۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا چنانچہ آپ سے کچھ شعر بھی منسوب ہیں ذیل میں ان میں سے چند بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

توں تو سہی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ہووے نرم نہ تجھ اد چڑے پس کھانے گا آزار توں
گھوڑے کوں بھیتر گھوڑ ہے، اس کوں نہ حکمت ہووے ہے
ہردم ذکر سوں توڑ ہے، غافل نہ ہو ہشیار توں
کر دسکلا دل گیان کا، انعام دے خوش دھیان کا
چارا کھلا ایمان کا، رکھ باندھ اپنے دار توں
خوگر شریعت نعل بند زین ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند سنگھ معرفت اختیار توں
تب قید گھوڑا آئے گا، تجھ لامکاں لے جائے گا
تب عشق جھگڑا پائے گا، خدمار لے تروار توں
شہباز حسینی کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ آپے یک ہووے کر تب پاوے گا دیدار توں

یہ غزل مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" کے ص۲۶ پر درج کی ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "...... بیاض مکتوبہ ۱۰۶۸ھ کے علاوہ دو اور بیاضوں میں ان کی ایک غزل قدیم طرز ریختہ میں پائی ہے، جس کی نسبت یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں کی ہے۔ البتہ مقطع میں تخلص انھیں کا ہے۔" مگر مولوی صاحب نے اپنے شک کی وجہ ظاہر نہیں فرمائی کہ اس غزل کو یقینی طور پر خواجہ صاحب سے کیوں نہ منسوب کیا جائے۔

نظامی کی مثنوی

عہد بہمنیہ ہی سے دکھن کی ایک مثنوی "کدم راؤ و پدم راؤ" عبارت ہے۔ اس مثنوی کے مصنف کا نام نظامی تھا، یہ بہمنی سلطان احمد شاہ ثالث کے عہد میں گذرا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نظامی اُردو زبان کا سب سے پہلا مثنوی نگار تھا۔ کیونکہ جدید تحقیق کے مطابق اُس سے پہلے کسی اور مثنوی نگار کا سُراغ نہیں لگ سکا ہے۔ مثنوی کدم راؤ و پدم راؤ کی زبان اور اس میں استعمال شدہ الفاظ کو دیکھتے ہوئے حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ دکھنی اُردو کی قدیم ترین نظم ہے۔ ذیل میں اس کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔ اس کی ابتداء میں کچھ شعر حمد اور نعت کے ہیں۔ اس کے بعد مرحوم بادشاہ سلطان علاء الدین بہمنی کی مدح بیان کی گئی ہے۔ پھر اصل مثنوی شروع ہوئی ہے اصل مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کدم راؤ کہیں ان دنہ آدھر — کہ رھن بات سن بات یک بت دھر
سینا لکھا کی ناری دہری بہت چند — سو میں آج دیتا تری چند بند
دھسی جہند جب ہیں دنیا جگ میں — نتی دبل تھے ہتن ہوی پر بار ک میں
سجات ایک ناگن کجات ایکا سانپ — دسنکت دھتی کھلیں لانپ چھانپ

جو کرنا رجگوں کیا ہوئی راؤ   اسنکٹ کر کیوں دیکھ سکوں اپناؤ

پدم راؤ نہیسا مہیسا کر دیں   کندل پیر اؤ بہا ہوا اسر دیں
پھر اتر ہو جیوں رہیا تھا او محل   کمان ہو پر یا پنکھ کی پائے تل
اجاسیں پا مر کیسی بکہ نبات   نیوں کوئی نبوی نہ نا کر جاٹ
کر توں ساج پیر اگسا نیں کدم   پرم راؤ تجبہ پاؤ کیرا پدم
جہاں تو دھرے پاؤ دھول سر ٹیزان   ایس سار کی لگ ترای گردن[ا]

اس دور کی اُردو پر تبصرہ بہمنی عہد کے اقوال اور نثر و نظم کے نمونے ہمارے سامنے ہیں انھیں دیکھ کر سب سے پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بول چال اور نظم و نثر پر مقامی رنگ زیادہ غالب تھا۔ پراکرت اور دکھنی زبانوں کے الفاظ کی بھرمار تھی۔ عربی، فارسی، ترکی اور پشتو زبانوں کے الفاظ بہت کم تھے اور جو چند تھے بھی تو اُن کی اصلی صورت بگڑی ہوئی تھی۔

اس عہد کی اُردو کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حُسن و عشق کا مادی تصور سرے سے نا پید تھا۔ نثر ہو یا نظم ہر صنف پر روحانیت کا غلبہ تھا۔ خدا اور رسول کا عشق، نیکی و تقویٰ، پرہیز گاری اور نجاتِ اُخروی اس عہد کی نثر و نظم کے موضوع تھے ایسا کیوں تھا؟ شاید اس لئے کہ اس عہد میں جن لوگوں نے نظم و نثر کو آگے بڑھایا اور اس میں تخلیقات پیش کیں وہ خود روحانی لوگ تھے۔ صوفی صافی۔ درویش

[ا] "دکن میں اُردو" صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ مصنفہ نصیر الدین ہاشمی۔

خدا پرست جیسے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور سید محمد عبداللہ حسینی جو حضرت خواجہ بندہ نواز کے نبیرہ تھے۔ اور جنھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے رسالہ "نشاط العشق" کا دکھنی اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا[۱]۔ ان سب بزرگوں کا ایک خاص مقصد تھا۔ یعنی خدمتِ اسلام اور تبلیغ اسلام۔ اسلامی عقائد کی تبلیغ و تشہیر۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اور نتیجے میں اس عہد کی اردو کا دامن تصوف مانہ اور اصلاحی قسم کی نظم و نثر کی تخلیقات سے بھر گیا۔ صرف ایک مثنوی ضرور ایسی نظر آتی ہے جو کسی حد تک روحانیت کے اثرات سے بچ گئی ہے۔

اس عہد کی نظم و نثر کا مطالعہ کرنے سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی ابتداء ہی مقصدیت سے ہوئی۔ اس کی بنیاد کا پتھر رکھنے والے ادب برائے ادب کے نہیں" ادب برائے مقصد" کے قائل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مقصد ترویج مذہب اور اشاعتِ اسلام تھا۔

---

[۱] فہرست کتبخانہ ٹیپو سلطان صہ ۱۸۲ بحوالہ تاریخ زبان اردو صہ ۴۴

سلطنتِ قطب شاہی۔ اور اُردو

بہمنی سلطان محمود شاہ کے زمانے ہی سے خاندانِ بہمنی کا خورشیدِ اقبال روبہ زوال ہونے لگا۔ امراء نے بغاوتیں کرنی شروع کردیں۔ نظم و نسق میں ابتری پیدا ہونے لگی۔ اور سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی مختلف صوبیدار خودمختار ہو گئے۔ انھیں خودمختار صوبیداروں میں قلی قطب شاہ بھی تھا جو آگے چل کر سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اور خاندانِ قطب شاہی کا بانی کہلایا۔

بانیٔ سلطنتِ قطب شاہی قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ ایران کا رہنے والا تھا اور ترک قبیلہ "قراقوئنلو" سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان ایک زمانے میں تخت و تاج کا مالک تھا۔ مگر انقلابِ زمانہ اور قبائلی رقابت نے اسے تاج و تخت سے محروم کردیا اور اس قبیلہ کا حریف قبیلہ "آق قوئنلو" برسرِ اقتدار آگیا، حالات کو ناسازگار پاکر قلی قطب شاہ اپنے چچا امیر قلی کے ساتھ ترکِ وطن کرکے دکن چلا آیا۔ اُس زمانے میں دکن میں خاندانِ بہمنی کا طوطی بول رہا تھا اور سلطان محمود شاہ کا زمانہ تھا۔ قلی قطب شاہ اپنے چچا امیر قلی کے ساتھ محمود شاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اُس کی خدمت میں چند ترکی گھوڑے اور کچھ تحائف پیش کئے۔ سلطان محمود نے ان نووارِدوں کی نذر قبول کی۔ ان کی رہائش کا انتظام کیا۔ اور ان کے حال پر ایسا مہربان ہوا کہ قلی قطب شاہ تو اُس کے خاندان کا ایک فرد نظر آنے لگا۔

کچھ عرصے کے بعد بہمنی سلطان محمود شاہ کے محل پر حبشیوں اور دکنیوں کے ایک گروہ نے حملہ کردیا۔ اس وقت بادشاہ شغلِ مے و مینا میں مشغول تھا، پری وشوں

کا مجمع تھا اور رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ حسنِ اتفاق کہ اس موقع پر قلی قطب شاہ بادشاہ کی حفاظت پر مامور تھا۔ اس نے بڑی شجاعت سے شورش پسندوں کو پسپا کیا اور بادشاہ کو وہاں سے نکال کر محفوظ مقام پر پہونچا دیا۔ اور پھر دوسرے سرداران فوج کو ساتھ لے کر باغیوں کی سرکوبی کے لئے نکلا اور دن ہوتے ہوتے ایک ایک باغی کا صفایا کر دیا۔

سلطان محمود شاہ قلی قطب شاہ کے اس جرأت آمیز کارنامے سے بے حد خوش ہوا اور اسے قطب الملک کا خطاب دیا۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد دو سرداروں ملک دینار حبشی اور ملک خوش قدم ترک نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس معرکے میں بھی قلی قطب شاہ نے حیرت انگیز جرأت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا سلطان محمود شاہ جو پہلے ہی قلی قطب شاہ سے بے حد متاثر تھا ان نئے کارناموں کو دیکھ کر اور بھی خوش ہوا اور اسے صوبہ تلنگانہ کا طرفدار بنا کر "امیر الامرا" کا خطاب عطا فرمایا۔ یہی نہیں بلکہ "کوٹ گیر" اور "اوٹ کائی" کے علاقے بطور جاگیر دئے۔ غرض اسی طرح بعض اور لڑائیوں میں بھی قلی قطب شاہ نے بڑی جرأت اور شجاعت کے مظاہرے کئے خصوصاً پوٹا ناٹک نامی ہندو سردار کے مقابلے میں اس نے بڑی دلیری سے جنگ کی اور اس کے بہادر بیٹے دلیو ناٹک کو قتل کر کے اس کی فوج اور پوٹا ناٹک کی کمر ہمت توڑ دی۔ آخر پوٹا ناٹک نے ہتھیار ڈال دئے۔ اس کارنامے کے صلے میں قلی قطب شاہ تلنگانہ کا حاکم بنا دیا گیا۔ اس کے بعد قلی قطب کا اختیار اور اثر و رسوخ اور بھی بڑھ گیا اور ہر نازک سے نازک اور اہم سے اہم معاملے میں اس کے مشورے شامل ہوتے تھے اور ہر مہم اس کے ہاتھوں سر ہوتی تھی۔

سلطنت قطب شاہی کا قیام | آخر بہمنی سلطان محمود شاہ بیمار ہو کر ۴ ذی الحجہ

سنہ ۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) کو انتقال کر گیا۔ اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی مختلف امراء و صوبیداروں نے خود مختار ہو کر اپنے اپنے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر قلی قطب شاہ نے بھی تلنگانہ کی ولایت سنبھالی اور گولکنڈہ کو دارالسلطنت قرار دے کر آزادانہ حکومت کرنے لگا۔ اب وہ سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ نے رفتہ رفتہ قرب و جوار کے شر پسند ہندوؤں کی گوشمالی کر کے اُن کے بہت سے قلعے چھین لئے اور اس طرح اپنی حدودِ سلطنت کو بڑھاتا رہا۔

سلطان قلی قطب شاہ نے ساٹھ سال حکومت کی۔ سولہ سال بہمنی سلطان محمود شاہ کی طرف سے علاقہ تلنگانہ پر۔ اور چوالیس سال آزاد اور خود مختار حاکم کی حیثیت سے۔ سلطان قلی کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگ کرتے ہوئے گذرا۔ بیجانگر اور دوسری ہندو ریاستوں کے علاوہ قرب و جوار کے مسلمان حکمرانوں سے بھی اُس نے بارہا جنگ کی مگر اُس کا پرچم اقبال ہمیشہ بلند ہی رہا۔ اُس نے ہر معرکہ میں فتح حاصل کی اور اپنی قوتِ بازو سے سلطنت کو حیرت انگیز طور پر وسیع کیا۔

سلطان قلی قطب شاہ کی شہادت

آخر عمر میں جب ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا تو سلطان اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر اسے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ایک روز اتوار کے دن ۲ رجمادی الثانی سنہ ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) کو جب وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا شاہزادہ جمشید قلی کے اشارے سے میر محمود ہمدانی نے جو گولکنڈہ کا قلعہ دار تھا سلطان قلی قطب شاہ پر تلوار سے حملہ کر کے شہید کر دیا۔

سلطان قلی اور فنونِ لطیفہ

سلطان قلی قطب شاہ کی زندگی کا تقریباً سارا حصہ میدانِ جنگ ہی میں گذرا۔ اس لئے اسے تعمیرات وغیرہ کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ مگر اس نے ملک کی ترقی اور استحکام

میں کوتاہی نہیں کی۔ اُس کے دورِ حکومت میں خاص طور سے گول کنڈہ کی آرائش و زیبائش اور زیب و زینت میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ خوش نما باغات، دلکش اور پرشکوہ عمارات اور گول کنڈہ کی تاریخی مسجد اُس کے عہد کی یادگار ہیں۔ اپنا مقبرہ بھی خود اسی نے تعمیر کروانا شروع کیا تھا۔[۱]

شعر و ادب کی سرپرستی خاندانِ قطب شاہی تقریباً دو سو سال حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان میں آٹھ بادشاہ گذرے۔ جن میں سے بعض بہت ہی علم دوست اور اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ چنانچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے عہد کے قادر الکلام اور باکمال شاعر تھے۔ خود خاندانِ قطب شاہی کا بانی سلطان قلی قطب شاہ اگرچہ بظاہر صاحبِ سیف تھا اور اُس کی عمر کا سارا حصہ شمشیر زنی میں بسر ہوا۔ مگر اس کے باوجود اسے شعر و سخن سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس مقصد کے لئے "آتش خانہ" کے نام سے ایک محل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس محل میں سلطان قلی قطب شاہ شعراء کی مجلسیں منعقد کروا تا تھا اور بڑے ذوق و شوق سے اُن کا کلام سنتا تھا۔ غرض اس خاندان کے اکثر و بیشتر بادشاہ بہت علم دوست اور شعر و ادب کے سرپرست تھے۔ اور قطب شاہی عہد اُردو زبان و ادب کے لئے آبِ حیات کا حکم رکھتا تھا۔ اسی عہد میں مثنوی اور مرثیہ کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ دکن کے مشہور شعراء فیروز، محمود، وجہی، غواصی قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، فائز اور لطیف وغیرہم اسی دورِ قطب شاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[۱] اس باب کے تاریخی حالات قلم بند کرتے ہوئے "تاریخ ہندوستان" جلد چہارم مصنفہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، "تاریخ ہند" حصہ سوم مؤلفہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، اور تاریخ فرشتہ حصہ دوم سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

علماء و مورخین کی سرپرستی

علماء و فضلاء کی ایک کثیر تعداد بھی خاندان قطب شاہی کے دامنِ دولت سے وابستہ تھی۔ خورشاہ بن قباد الحسینی جو اس عہد کا بہت بڑا مورخ تھا سلطان ابراہیم قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ خورشاہ نے سلطان کے حکم سے دنیا کی تاریخ لکھی تھی جس میں ابتدائے آفرینش سے لیکر اس عہد تک کے تاریخی حالات درج تھے۔ خود سلطان ابراہیم بھی بہت بڑا عالم تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں میر محمد مومن استرآبادی جو علمائے ایران میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے دکن آئے اور محمد قلی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی تصنیفات میں "کتاب الرجعت" اور "کتاب المقادیر" مشہور ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں شمس الدین محمد المعروف علامہ ابن خاتون دربار قطب شاہی سے وابستہ تھے۔ یہ ایران کے مشہور بزرگ اور جید عالم شیخ بہاء الدین آملی کے شاگرد رشید اور اس عہد کے بہت بڑے فاضل تھے۔ "کتاب الارشاد" اور "جامع عباسی" کے حواشی انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ "اربعین" کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان کے علاوہ ملا جلال الدین ملا علی بن طیفور اور مولانا حسین آملی جیسے فضلائے زمانہ سلطنتِ قطب شاہی میں علم کی دولت لٹا رہے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کا داماد سید نظام الدین بھی اس عہد کا بہت بڑا عالم تھا۔ اور علوم ریاضی، فلسفہ اور حکمت کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کے تصنیف کردہ رسالوں کی تعداد ایک سو آٹھ ہے۔ یہ مختلف علوم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مجموعہ کو "شجرۂ دانش" کہتے ہیں۔

---

[۱] اس حصہ کو قلم بند کرتے ہوئے "تاریخ زبانِ اردو" صفحات ۴۹ تا ۵۲ سے خاص طور سے استفادہ کیا گیا ہے۔

عہدِ قطب شاہی کے شعراء

سلطان محمد قلی قطب شاہ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کا بیٹا تھا اور اُس کی وفات پر مسند آرائے حکومت ہوا تھا۔ اس کا سنہ پیدائش ۹۷۳ھ ہے۔ سنہ ۹۸۸ھ میں جب اس کی عمر پندرہ سال کی تھی تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ اُس نے بتیس ۳۲ سال حکومت کی اور سنہ ۱۰۲۰ھ میں فوت ہو گیا۔

سلطان محمد قلی کا عہدِ حکومت اس اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس عہد میں ہر طرف امن و امان تھا۔ سلطان محمد قلی بہت امن پسند اور صلح کل قسم کا فرمان روا تھا۔ پھر کچھ یہ بھی تھا کہ اس کے پڑوسی بادشاہوں اور راجاؤں میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو جنگ و جدل سے بچتے تھے، چنانچہ عادل شاہی خاندان کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نورس بھی جو سلطان محمد قلی کا معاصر اور پڑوسی تھا فطرتاً امن پسند واقع ہوا تھا۔ قرب و جوار کی ہندو ریاستوں سے سلطان قلی کے والد ابراہیم قلی کے زمانے ہی سے بہت اچھے مراسم تھے۔ غرض یہ کہ سلطان قلی کا سارا زمانۂ حکومت نہایت آرام اور اطمینان و سکون سے بسر ہوا۔ اور اسے کسی سے جنگ نہیں کرنی پڑی۔

سلطان قلی کا مزاج اور رجحان سلطان قلی کے مزاج میں ابتدائے عمر ہی سے لاابالی پن تھا۔ گو اُس کے دوسرے بھائی اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اُس زمانہ میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے مگر سلطان کی طبیعت کا رجحان علم کی طرف نہیں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ تلنگی اور فارسی زبانوں سے نہ صرف باخبر تھا بلکہ ان پر بڑی اچھی نظر بھی رکھتا تھا اور ان

زبانوں کا قادر الکلام شاعر بھی تھا۔ اسکے یہاں فارسی زبان کے شعراء میں سے حافظ شیرازی کا سب سے زیادہ اثر ملتا ہے۔ مگر علوم عربیہ یا فارسی زبان کے مروجہ علوم سے نابلد تھا کیونکہ سن شعور میں قدم رکھتے ہی عشق و عاشقی کے جھمیلوں میں پھنس گیا۔ اُسے حسین اور جوان عورتوں سے فطرتاً محبت تھی۔ محل یا محل کے باہر جہاں کوئی پری چہرہ لڑکی دیکھتا تھا دل دے بیٹھتا تھا۔ اس کے بعد فراق و وصال کے سلسلے شروع ہوتے تھے۔ مگر فراق کم بلکہ بہت کم اور وصال زیادہ۔

شاعری اُس کی اس حسن پرستی اور عشق و عاشقی کے لوازمات نے اُس کے شاعرانہ احساسات کو بیدار کر دیا اور وہ بڑے میٹھے اور والہانہ سروں میں اپنے سازِ احساس پر نغمہ سرائی کرنے لگا۔ اُس نے اُردو شاعری کے سرمایہ میں پچاس ہزار ابیات کا اضافہ کیا۔ اُس کے کلیات میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی قصائد، رباعیات، مرثیہ اور مثنوی، غرض مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ سلطان کی شاعری کے موضوعات مذہبی بھی ہیں، نیم مذہبی بھی اور غیر مذہبی بھی۔ اُس کے یہاں حمد و نعت اور منقبت سے لے کر عید میلاد النبیؐ، عید مولود علیؑ، عید غدیر، شب برات اور بقرعید وغیرہ پر نظمیں ملتی ہیں۔ غیر مذہبی موضوعات سے متعلق نظموں میں بسنت، برسات اور سرما، کھیل، میلے، مختلف رسومات، شاہی محلات اور اپنی محبوباؤں کے حُسن کا بیان، یہ اور ان جیسی اور بھی بہت سی نظمیں ہیں۔ غرض سلطان محمد قلی کا کلیات اُس کی رنگا رنگ طبیعت کی طرح رنگا رنگ موضوعات سے بھرا پڑا ہے۔

زبان سلطان محمد قلی مغل بادشاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ یہ آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال اُدھر کی بات ہے۔ اُس وقت اُردو اور پھر دکھنی اُردو ارتقائی منازل سے گذر کر موجودہ دور کی اُردو کی طرح صاف اور شستہ نہیں ہو سکی تھی۔

اُس وقت تک اُردو زبان پر دکھنی، پراکرت اور سنسکرت زبانوں کے اثرات موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان محمد قلی کے کلیات میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جنھیں بغیر فرہنگ کے سمجھنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر اِس میں محمد قلی کا کوئی قصور نہیں تھا اُس وقت کی زبان ہی ایسی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کے یہاں ایسے مصرعہ اور اشعار بھی موجود ہیں جن کی زبان نسبتاً صاف ہے بلکہ بعض مصرعہ تو آج کے زمانہ سے کچھ ہی قبل کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

محمد ہے اس زمانہ کا شاعر

جوں نور مولوی تھے روشن ہوا ہے ایمن
سے

مہتاب دھن رُخسار ہے، گل ریز گل کا ہار ہے
عورت کا

دکھ درد گیا عیش کے دن آئے کرم کام

یہ چار مصرعے بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔ اگر دوسرے اور تیسرے مصرعوں کے خط کشیدہ الفاظ کو بدل دیا جائے تو بہ اعتبار الفاظ اِسمیں اور موجودہ دور کی زبان میں کیا فرق باقی رہ جائے گا۔ پہلا اور آخری مصرعہ تو خاص طور سے عہدِ حاضر کی زبان میں ہے۔

مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شعر یا مصرعہ کلیات میں نسبتاً کم ہیں۔ پھر بھی اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے ابتدائی دور میں بھی اسے ایسے سرپرست مل گئے تھے جو اسے صاف اور شستہ کرنے میں پوری طرح کوشاں تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود اُردو زبان میں بھی ابتدا ہی سے آگے بڑھنے کی بہت صلاحیتیں تھیں۔

حلاوت سلطان محمد قلی کے کلیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس امر کا بھی احساس ہوتا ہے کہ اُس کی لے بہت مترنم اور میٹھی تھی۔ اُس کی زبان اور خیالات دونوں میں بڑی حلاوت تھی۔ یاس و حسرت اور قنوطیت جس سے بعد کی اُردو شاعری اپنا دامن نہیں بچا سکی محمد قلی کے کلیات میں برائے نام ملتی ہے۔ اس نے جہاں کہیں غم انگیز نے چھیڑی ہے اس میں بھی حلاوت موجود ہے۔ یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُس کی شاعری شگفتگیٔ خیال کی بہت اچھی مثال ہے۔

اب ذیل میں اُس کے کلیات میں سے مختلف اصنافِ سخن سے متعلق اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

حمد

چندر سورج تیرے نور تھے، نس دن کوں نورانی کیا
چاند سورج — سے — رات

تیری صفت کن کر سکے، توں آپی میرا ہے جیا
کون — تو — آپ ہی — روح

تج نام منج آرام ہے، منج جیو سو تج نام ہے
تیرا — میرا
سب جگ کوں تجھ سوں کام ہے، تج نام جب مالا ہوا
دنیا

تج یاد میں ہنگ موہیا، ہے جگ اُپر تیرا ایا
فریفتہ ہے — محبت

جو جگ منگے سو توں دیا، توں ہی جگت کا ہے دیا
مانگے

جیتا ہوں تیری آس تھے، آیا ہے رحم آکاس تھے
سے سے

جو کچھ منگوں تج پاس تھے، سو ہے سو منج کوں توں دیا
تجھ مانگوں سے مجھے تو

بہوتک میا سیتے اپنی، دتیا قطب کوں سب دکھن
بہت ہی محبت سے خود ہی

سیسوں نبی کا نت چرن سجب لگ ہے تن میانے جیا
سر پر ہمیشہ قدم جسم میں روح

نعت

دیا بندہ کوں حق نبی کا خطاب
حکم دے، دیا نور جوں ماہتاب

نبی نانوں لے کر کسی تھے نہ ڈر
نام

توں رسّی نمن سے دُندیاں کوں سو تاب
تو رسی کی طرح دشمنوں کو

حقیقی پیا سوں مجازی سیتیں
سے کے ساتھ

جو نسبت کرے گا تو پاوے عطاب
عتاب

نہ بھاوے منجے پیو بن ہور کچ
پیا کے بغیر اور کچھ

میں تیری ہوں چیری منجے آپ راب
غلام مجھ سے خود کام لے

نہیں ہیم میں کوئی خنشہ مثال

صیحی مانے یہ بات کوں شیخ و شاب
صحیح

بھرے ہے پیم میداں میں دو شہسوار
محبت کے دو

سہیلیاں سبھی چو ہیں اس کار کاب

نبی صدقے ہے ترکماں داس امام   ہو وو جگت تپ سوال وجواب

غلام

منقبت

دنیا و دیں کا سنگار یا علیؑ توں   سب اولیا کے من کا اسرار یا علیؑ توں

آرائش   تو

سورج توں نوا نبر کا دیوا سو دین گھر کا   پیارا سو پیغمبر کا سچ یار یا علیؑ توں

آسمانوں چراغ   دکے)

سب جگ میں ناؤں تیرا ہے سب پہ چھانو تیرا   ہر ٹھانو ٹھانو تیرا، اوتار یا علیؑ توں

نام

برحق ولی توں رب کا، صاحب سچا ہے سب کا   معراج کی سو شب کا جھلکار یا علیؑ توں

قطباً گنا ئیا ہے مولود آج تیرا   عشرت انند وے اس نت پار یا علیؑ توں

گوایا

بسنت

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا   تمھیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا

بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں   کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری   بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا

پیا کے قدم   لاکر

بھیگی چولی ہو کیں بس نشانی   عجب سورج میں ہے کیوں نسی کوں ٹھکارا

رات

نبیؐ صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ

رنگیلا ہو رہیا تر لوک سارا

رہا   عالم

سانولی

مری سانولی من کی پیاری دسیے　　　کہ رنگ روپ میں کونلی ناری دسیے
نظر آئے

ہے سب سہیلیاں میں بالی عجب　　　سرو قد ناری اوتاری دسیے
توں سب میں اُتم ناری، تج سم نہیں　　　کویل تیری بولاں تھے ہاری دسیے
تیرے مقابل　　　تے

تیری چال نیکی ہمیں من کوں بھائے　　　سکیاں میں توں جوں پھل بھاری دسیے
پھول

بہوت رنگ سوں آپ رنگیاں سکیاں　　　ولے کان تیرے رنگ کی ناری دسیے

نبیؐ صدقے قطبا پیاری سدا
سہیلیاں میں زیبا تہاری دسیے

غزل

کہیا کہ بوسہ سینی ہمن تم جو اں کرو　　　کہئے پرت کی بات تمن جیو کا جاں کرو
کہا　　　تم

کہیا ادھر تہارے جیون کوں جلاوتے　　　ہنس کر کہی یہ بات نکو تم بیاں کرو
کہیا کہ حق پرستی کرو بت پوجن سٹو　　　کہیا کہ دونوں بات میں ایک امتحاں کرو
کہیا کہ آدمی کا مروت نہیں، تمن　　　کہئے کہ بس ہے عشق تہارا نہاں کرو
کہیا کہ عاشقاں کوں دکھانے کا بھید کیا　　　کہئے کہ عاشقی منے گونگی زباں کرو
تم کو

کہیا کہ مرحمت کی نظر سوں نواز مجھ　　　کہئے ہماری پنتھ منے جاں فشاں کرو
سے　　　راہ　میں

کہیا تمہاری سیو امعانی کا دوست ہے
کہئے کہ تم بھی سیو ابر ابر شہاں کرو

رُباعی

کہیا ترے لب کیا ہیں، کہی آبِ حیات — کہیا کہ تیری لبدا، کہی حبِّ نبات
کہیا کہ بچن تیری، کہی قطب کی بات — اس میٹھی لطافت پہ سدا ہے صلوات

مرثیہ

لہو اوتیں ہیں بی بی فاطمہؓ اپنے حسنیاں تیں — او لہو لالی کا رنگ سا تو گگن اپرال چھایا ہے
کے لئے — وہ — اوپر

اماماں پر ہوا سو دکھ تکو پوچھو مسلماناں — ہر یک امام پر یک دکھ بہت گھاتاں لسایا ہے
ظلم کیسا ہوا ہے آہ دنیا میں اونن اوپر — تیا ظلم و بلا سب فاطمہ خاطر ملایا ہے
اگارہ مہینے کے نمنے محرم کیوں نہیں ہی تول — سبھی مہینے میں خوشیاں کرتے توں اب دکھ لسایا ہے
گیارہ — مانند

کیا ہے میہمانی یوں اماماں کا محرم توں — جنگل میں کربلا کے سب سبیاں کو بلایا ہے
گئے ہیں مومناں کسوت حسنؑ کے زہر تھے ہریا — سو اس کے چھاوں تھے اسماں اپنا رنگ بھجرایا ہے
تے

خدایا قطب شہ کو بخش توں حرمت اماماں کی
کہ اُن کی مدح کا حلقہ مرے کن میں سہایا ہے

وجہی | وجہی پہلے ابراہیم قطب شاہ اور پھر محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اُس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کا بھی زمانہ دیکھا تھا۔ اُس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا بہت بڑا اہلِ قلم تھا، وہ اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا اور چوٹی کا

نثر نگار بھی۔ چنانچہ ان دونوں میدانوں میں اُس نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ "سب رس" نثر میں اور مثنوی "قطب مشتری" نظم میں۔ وجہی کو اپنی نظم و نثر پر بڑا ناز تھا وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا عام طور پہ تذکرہ نویسوں نے اُس کے غرور اور تعلی کی شکایت کی ہے مگر اُس کے کمال کے وہ بھی معترف ہیں۔

قطب مشتری

مثنوی قطب "مشتری" ۱۰۱۸ھ میں — لکھی گئی تھی۔ اس میں محمد قلی قطب شاہ کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی حمد سے شروع ہوئی ہے۔ مناجات، نعت، ذکرِ معراج، اور منقبت کے بعد عشق کی صفت بیان کی گئی ہے۔ پھر شعر کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے بعد "وجہی تعریف شعر خود گوید" اور پھر ابراہیم قطب شاہ کی مدح ... ہے۔ اُس کے بعد محمد قلی قطب شاہ کی صفات اور حسن و شباب کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر مجلس طرب کا بیان ہے۔ یہیں سے اصل قصہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ محفلِ عیش و طرب گرم تھی۔ پری چہرہ اور گلبدن نازنین کیف و سرور بکھیر رہی تھیں۔ شراب کے دور چل رہے تھے۔ ہر شخص مست تھا۔ محمد قلی قطب شاہ بھی جام پر جام لنڈھا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد بادشاہ کو نیند آگئی۔ اُس نے خواب میں ایک ماہوش پری تمثال کو دیکھا ہوش و حواس، رخصت ہوئے۔ صبر و شکیب نے رفاقت چھوڑی۔ جب آنکھ کھلی تو جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ لاکھ کوشش کی گئی کہ شہزادہ اپنی اصلی حالت پر واپس آجائے۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر پوری تیاریوں کے ساتھ اُس نازنین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں بڑے بڑے مصائب اور شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا۔ آخر بڑی دشواریوں کے بعد بنگال پہونچے۔ وہاں اُس نازنین سے ملاقات ہوئی۔ اُسے بھی ان سے محبت ہوگئی اور پھر یہ اُسے لے کر گولکنڈہ آگئے۔ یہاں بڑے تزک و احتشام سے شادی ہوئی۔

یہ مثنوی کم و بیش دو ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے اس میں چار ساڑھے چار سو کے لگ بھگ اشعار ہیں۔ درمیان میں رباعیاں اور غزلیں بھی ہیں۔ یہ مثنوی مختلف عنوانات کے تحت کئی حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ ہر نیا واقعہ ایک نئے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔

اس مثنوی کا ادبی مقام

وجہی کی اس مثنوی سے پہلے محمد قلی قطب شاہ اور اُس سے بھی پہلے عہد بہمنی کے ایک شاعر نظامی کے یہاں بھی مثنوی کا وجود ملتا ہے۔ اور شاید نظامی پہلا شاعر ہے جس نے اُردو زبان میں مثنوی کی ابتدا کی۔ لیکن نظامی کی زبان اور اسلوب دونوں بہت نامانوس ہیں اس لئے اُس پر کوئی محاکمہ نہیں ہو سکتا، سلطان محمد قلی کے شاعرانہ مرتبہ پر گذشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔ مگر اس نے مثنوی کی طرف بہت کم توجہ کی ہے غزل اور نظم کی دوسری اصناف میں تو اس کے یہاں بعض اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی ہیں۔ صرف وجہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے اگر مثنوی کو معراجِ کمال پر نہیں پہونچایا تو آگے ضرور بڑھایا۔ بہت آگے۔ قصہ کی ترتیب اُس کے مختلف حصوں کی تقسیم۔ زبان و بیان، تشبیہ و استعارہ جذبات نگاری، اسلوب غرض ہر حیثیت سے یہ اُس عہد کی بہت اونچی مثنوی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زبان پر دکھنی اور ہندی اثرات موجود ہیں مگر پھر بھی بہت سے شعر صاف اور سادہ ہیں جنہیں بغیر کسی الجھن کے با آسانی پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا گیا ہے اور بعض بعض جگہ تو ایسی لطیف تشبیہیں اور ایسے خوبصورت استعارے ہیں کہ دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اور وجہی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج تحسین ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً

اچھلتیاں ہیں بجلیاں اچھالاں تلے   کرنیاں جھمکتے ہیں بالاں تلے

یعنی اُس کی آنکھیں بالوں میں سے یوں چمکتی ہیں جیسے بادلوں میں بجلی۔

بساشہ کے انصاف تے یوں دکھن کہ بستا ہے پانی سے جوں پھول بن

یعنی بادشاہ کے عدل انصاف کی بدولت دکھن یوں آباد ہے جس طرح چمن پانی سے آباد اور سرسبز ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ وجہی کی ذہنی اپج کا کرشمہ ہے۔ اسے کسی غیر زبان سے ترجمہ نہیں کیا گیا اور نہ خیالات مستعار لئے گئے۔ اس مختصر سے تبصرہ کے بعد ذیل میں وجہی کی اس مثنوی کے چند شعر (انتخاب) درج کئے جاتے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق صاحب کے مرتب کردہ نسخہ سے نقل کئے گئے ہیں۔

صفتِ مجلسِ طرب

شہنشہ مجالس کئے ایک رات وزیراں کے فرزند تے سب سنگات
ہر یک خوبصورت ہر ایک خوش لقا سو ہر ایک دلکش ہر ایک دلربا
ہر یک خوش طبع ہور عاقل اچھے ہر یک خوش فہم ہور فاضل اچھے
صراحی پیالے لے ہاتاں منے ندیماں سے تے مشغول باتاں منے
لگے مطرباں گانے یوں ساز سوں کہ دھرتی ہلی مست آواز سوں
شراب ہور صراحی نقل ہور جام ہوئے مست مجلس کے لوگاں تمام
جو ہوئی رات آدھی پچھے دو پہر خبردار یاراں ہوئے بے خبر
بسر گئی ندیماں طرز بات کا گنوائے خبر مطرباں ذات کا
لگے مست ہو سٹنے مستی سنگات بھسکے سو باواں اُپر ایک ہات
یکس کوں بلا ایک اڑنا نوں ہول گلے لگنے تھے مست ہو چھاتوں سوں
نیا مست ساقی ہوا شد گنوائے کہ پیالا منگے تو صراحی کون لائے

سو ویسے میں ٹک شاہ کوں نیند آئی — دو نیند آ تماشے عجب کچ دکھائی
دیکھے خواب میں شہ کہ یک بن رہے — دو بن نیں زمیں کے اُپر گھن رہے
پھریں چاندنیاں سندریاں اُس منے — ستارے نمن کیاں پریاں اُس منے
ہلادیں جو ٹک لٹ کی زنجیر کوں — دیوانا کریں تل منے نیز کوں
اُٹھا حوض ہو رواں اتھیاں سندریاں — کہ پانی کناٹے کھڑیاں تھیاں پریاں
چمن در چمن سرو دو رست تھے — کلیاں سرخوش ہوا پھول ہو مست تھے
اُٹھا محل واں ایک ایسا بلند — پوں سار نا ہو سکے سٹ کمند
یکایک اُس محل پر ایک نار — کنک چھند سوں آئی اُس پیں سنگار
جو دکھلائی آنکھ کعبہ سو دھن — سر دُھر نوائے تھے سجدا کرن
دسے یوں دھن اس محل کے فرش پر — سورج سار ہوا ہے مگر عرش پر
دو کچ دو مفرح کی کانسے ہے جیوں — دو زلفا او دھر سرک بھاسے ہی جیوں
زنگار رنگ جمناں منے پھول تھے — نول شہ تماشے میں مشغول تھے
پری اوچنتی وشت اس نار پر — اُخل گم ہوئی شہ ہوا بے خبر
جو اُس نیند میں تے ہوا ٹک ہشیار — نہ تھی اُس صبوری نہ تھا اُس قرار
لگیا تلملانے بہوت دھات سوں — کھیا جائے نا بات وو بات سوں
نہ یو بات ہر ایک کوں نام ہووے — وہی جانے جس پر جو یو کام ہووے
کدھیں چکہ ہنسے ہو کدھیں چکہ روے — کدھیں ٹھنڈ پاوے کدھیں تتد کھووے

پریشان حیران، بے تاب تھا
نہ کچھ اسکوں آرام نا خواب تھا

احمد احمد بھی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور اُس دور کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ "اُردو شہ پارے" کے مصنف

نے بھی اسے "سلطان محمد قلی کے زمانہ کا دوسرا مشہور شاعر" قرار دیا ہے اس کا نام شیخ احمد تھا۔ برہان پور کا رہنے والا تھا۔ اُس کے نام سے دو مثنویاں منسوب ہیں۔ ایک مثنوی "لیلیٰ مجنوں" جو اُس نے سلطان محمد قلی کی فرمائش پر لکھی تھی، اور دوسری مثنوی "مصیبت اہل بیت"۔ احمد کی مثنویاں دیکھ کر اُس کی قادر الکلامی کا تو ضرور اندازہ ہوتا ہے مگر اُس کے یہاں وہ رعنائی خیال نہیں ہے جو وجہی کے مثنوی کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ زبان بھی بقول ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری "کم و بیش وجہی سے مشابہت رکھتی ہے اور ہندی الفاظ اور جملوں سے مالا مال ہے"۔ ذیل میں اُس کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار حافظ محمود شیرانی مرحوم کی معرکتہ الآرا تصنیف پنجاب میں اُردو کے صفحہ ۲۲۹-۲۳۰ سے نقل کئے گئے ہیں۔

مثنوی لیلیٰ مجنوں

جو لیلیٰ و مجنوں تھے بولوں پُراں — سو تازہ کروں اب انو کا پراں
جو اس بن چمن پر تے گذرے پون — پون پاس تھے باس لے سرگ بن
جواس باغ پر شہ کا داغ ہے — سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے
دہنی باغ کا شہ میں باغباں — بھنور باغ کا کیوں نہوی آسماں
جو اس باغ مہکار تھے جگ بھرے — سو سر مست کر قدسیاں کوں دھرے
سو کچ شہ کوں یہ بن مبارک رہو — جو اس بن تھے ہر روز نو روز ہو
جکوئی باغ کی باغبانی کرے — سو اس باغ سے شادمانی کرے

---

[۱] اردو شہ پارے صفحہ ۹۸ مصنفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری۔

دہنی باغ کا باغباں کوں نواز　　بہو مرحمت سوں کرے سرافراز

جو احمد کرے آس دہر بن سنگار

سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

مثنوی مصیبت اہل بیت

دیکھو یاراں معصوماں پر وقت کیسا آپڑیا　　پردیس جانی طفلاں اوپر کیا مشکل اکھریا

دو نو فرزند مسلماں کی الہتی چھپے قاضی پاس　　ڈو کر قاضی کا پڑیا گھر سوں پکڑ انپی جیو کی پاس

کوتوالیاں لائی پکڑ کر عبداللہ کوں دی خبر　　بھجیاں ان کوں بندی خاں کیہاڑا کو قید کر

تو حرم کوں بلا انپی شہ وصیت کے تمام　　رونا پٹنا زاری کرنا مومناں کو حرام

ولی میری سکینہ آج ایتیم ہو چکی اس وقت　　میری بعد از یتیماں پر غصہ کرنا ناسخت

ہمیں ستمک چوتاتی پائن شہادت یاحیں　　ہمنا خاطر دشمنا میں زاری کرنا نا تمن

غواصی

غواصی گول کنڈے کا رہنے والا تھا۔ پہلے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ سلطان محمد قلی کے انتقال کے بعد بھی دربار سے وابستہ رہا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ سلطنت میں اس کی شہرت و مقبولیت میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ گو اس کی شاعری کا آغاز سلطان محمد قلی کے عہد میں ہو چکا تھا۔ مگر محمد قلی کے درباری شاعر وجہی کی وجہ سے اس دربار میں اُسے کوئی خاص مقام حاصل نہ ہو سکا۔ وجہی اور غواصی ایک دوسرے کے حریف تھے۔ دونوں اپنے آپ کو اس عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور دونوں کے مزاج میں تعلی تھی۔ "اردو شہ پارے" کے مصنف کے بقول ابتدا میں مفلوک الحال تھا۔ چنانچہ جب اُس نے اپنی پہلی مثنوی "سیف الملوک" لکھی تو اسکی مالی حالت بہت ہی سقیم تھی۔ مثنوی کے خاتمے پر اُس نے جو شعر لکھے ہیں۔

اُن سے اُس کی اس آرزو کا اظہار ہوتا ہے کہ کاش میرا کلام بادشاہ کو پسند آجائے تاکہ میری مصیبتوں میں کمی ہوجائے۔ مختلف تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ اُس کی یہ خواہش پوری ہوگئی اور چند سال کے بعد اُس کے دن پھر گئے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ اُس کی بہت قدر و منزلت کرنے لگا۔ اُس وقت درباری شاعروں میں سب سے اونچا مرتبہ اُسی کا تھا۔ ایک بار شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھی بھیجا گیا۔ وہاں سے فرمانروائے بیجاپور کی طرف سے اُسے بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ خیال ہے کہ اس کا انتقال ۱۰۶۱ھ میں ہوگیا تھا۔

غواصی کی تصانیف میں دو مثنویاں ملتی ہیں پہلی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور دوسری "طوطی نامہ"۔

سیف الملوک "سیف الملوک" "الف لیلہ" کی ایک داستان ہے جس میں مصر کے شہزادہ سیف الملوک اور اجنہ کی شہزادی بدیع الجمال کے حسن و عشق کا بیان ہے۔ فارسی کی اس داستان کو غواصی نے دکنی زبان میں نظم کردیا ہے۔ یہ مثنوی دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور ۱۰۳۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اس کے لکھنے میں ایک ماہ صرف ہوا۔ خاتمہ کے شعر سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

برس ایک ہزار ہوا پنج تیس میں　　　　کیا ختم یو نظم دن تیس میں

غواصی کی یہ مثنوی جذبات نگاری کے اعتبار سے بہت اونچی نظم ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غواصی کو تصویر کشی میں کمال حاصل تھا خصوصاً اُس نے جہاں جنگ کا نقشہ کھینچا ہے اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس پر ہندی تراکیب اور ہندی محاوروں کا رنگ غالب ہے۔ انداز بیان بعض بعض جگہ صفائی اور سادگی قابل ذکر ہے۔ ذیل میں سیف الملوک کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

شاہ دریائے قلزم اور شیر بابل کی لڑائی

ہوئے جمع جنگی ہنر براں تمام — قوی ہور خونخوار امیراں تمام

یک یک جاں یک کوہ یا برج جیوں — لے ہاتاں میں فتنے بھرے گرز جیوں

غضب ناک ہو جیوں اژدہے دل ہوئے — کلیجے پہاڑاں کے پھوٹ جل ہوئے

سلح پوش پولاد کے کوٹ جیوں — پُر آشوب سمندر کی کوٹ جیوں

او تالے ہو آفت بھرے عزم سوں — کھڑے آکے میداں میں رزم سوں

بھباؤ جیوں قہر کا شور سات — شطمت کی اگن سلگ اٹھی زور سات

کئے قصد لڑنے کوں دو دہیر تھے — زمانا ہوا تل اوپر کسیر تھے

او ٹھیا غل جدھر کا ادھر مار مار — قیامت زمیں پر ہوا آشکارا

جھلک دیکھ بجلیاں سی تروار کی — اوڑی فاختہ سخت سنسار کی

کٹے دہشت پریوں منڈیاں کاٹ کاٹ — سو کس کوں سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ

جو دریا لہو کا اُبلنے لگیا — گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا

سراں تیر اس لہو کے سمندر تھے — جو دستے تھے جیوں بُربُرے دور تے

دہشراں سب نیٹ موج کی لوٹ مار — کھتے ڈبتے نکلتے نہنگاں کے سار

بلایاں کی باناں کوں جیوں آگ لائے — زمیں ہور زمانے کوں دتیا گ لائے

غضب پر غضب کا جو مارا ہوا — سو ایسا بڑا تج دھولارا ہوا

لیا گرد جا ڈہانپ آسماں کوں — دھنواں سانپ ہو نگلیاں بھان کوں

بڑا دن بڑا یا سخت رگڑا ہوا

کہیں نہیں سُنا سو بو جھگڑا ہوا

طوطی نامہ | طوطی نامہ دراصل ملا ضیاء الدین نخشبی کی فارسی تصنیف ہے۔ غواصی

نے اسے دکنی کا لباس پہنا دیا ہے یہ ۱۰۴۹ھ میں اختتام کو پہونچی تھی، خاتمہ کے شعر میں اُس نے اس کا اظہار کیا ہے۔

برس یک ہزار ہور چالیس پہ نو   ہوئے تھے یو موتیاں پوردیا ہوں تو

"سیف الملوک" کی طرح غواصی کے "طوطی نامہ" کا اسلوب بھی سادگی اور دلکشی لئے ہوئے ہے۔ اور اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غواصی الفاظ اور خیالات دونوں پر قدرت رکھتا تھا۔ ذیل میں اس مثنوی کے ایک حصّہ میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں

وفادار عورت

سینا ہوں جو تھا کوئی یک لشکری   اسے ایک عورت تھی جیوں شہپری

طوطی نامہ

جی اس جوہراں کے سمندر کا کیر   ہے غواص اس دور میں بے نظیر
سو یو جوہراں کار لیا تا ہے بہار   جو ملک ہندوستاں میں ایک ٹہار
کہتے ہیں جو تھا کوئی سوداگر ایک   وجاہت میں نے پاک صورت میں نیک
اتم مال کا ہور کنے بخت دار   کہ اس کا سو تھا عین بندر کے تبار
جتے اس زمانے میں سوداگران   وتے اس کے انگی تہی جیوں چاکران
کیا تھا خدا یوں اسے سرفراز   جو تہے ساتوں سمدور پر اس کے جہاز

سدا تازہ تھا ذوق کا باغ اُس   ولے فرزند ہن نہیں سو تھا داغ اُس
کیکدیس پہنچن کو ن او باغ جگ   خدا کے کرم تے ہوا باغ جیوں

پھر اُس کا جھلک نے لکیا نور تے ستارا چل آیا مکر دور تے

جینے ایک مجوب مہتاب سے لطافت میں نرمل نچھل آب سے
دہند اترت پیدا کیا کر نہ دیر کیا لا کر خوشیاں شتے کار خیر[1]

سلطان محمد قطب شاہ

یہ سلطان محمد قلی کا بھتیجا اور داماد تھا۔ محمد قلی کے انتقال کے بعد ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ قطب شاہی سلاطین میں قابل ذکر سلطان تھا۔ مملکت کی ترقی و استحکام میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اسے عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ شعر و ادب کا پاکیزہ اور ستھرا مذاق رکھتا تھا۔ خود شاعر تھا۔ دکھنی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ دکھنی میں قطب اور قطب شاہ اور فارسی میں ظل اللہ تخلص تھا۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بہت علم دوست بادشاہ تھا۔ بہت بڑے کتب خانہ کا مالک تھا۔ شعراء کا بہت بڑا قدرداں اور سرپرست تھا۔ غواصی کے علاوہ قطبی، جنیدی، ابن نشاطی، احمد، شوقی اور خیالی اس کے عہد کے مشہور شعراء تھے۔ ۱۰۳۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ہزاروں شعروں کا دیوان چھوڑا ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ رباعی، ترکیب بند اور مرثیے بھی کہے۔ بقول ڈاکٹر سید محی الدین قادری .... "محمد قطب شاہ کا کلام محمد قلی کے اشعار سے اسلوب کی خوبی اور سادگی میں کسی طرح کم نہیں ہے۔" مگر آگے چل کر انھوں نے اس کے کلام پر بحیثیت مجموعی یہ رائے دی ہے کہ "سلطان محمد قطب شاہ محمد قلی کی ٹکر کا شاعر تھا۔" ذیل میں اس کا نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] "یورپ میں دکھنی مخطوطات" صفحہ ۶۰ و صفحہ ۶۱ مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی

غزل

چلے چاندنی میں جب لنک پیو ہمارا — او فن عکس دیپے چندر تھے اپارا
جنے سائیں کے عشق کا مد پیا ہے — نکر سی او سے ہور مستی اوتارا
نبی صدقے قطبا کا من تجہ سوں لاگیا — کہ اپ جیو میں تیرا کہتا ہے ٹھارا

خداداد محل

خداداد محل کوں سنوارے — توں اس میں جنت کے نگاراں نگارے
بلندی محل کا ہے آسماں جیسا — سورج چاند مارے سوں اس تھے سنگار
نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسے محل کوں — مگر وہ ہیرت پر قدسیاں کیا لے ٹھارے [1]

قطبی | اس نام کے دو شاعر گذرے ہیں۔ ایک قطبی دکھن میں اور دوسرا قطبی شمالی ہند میں تخلص کے اشتراک سے بعض تذکرہ نویسوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور قطبی دکھنی کا کلام شمالی ہند کے قطبی سے اور شمالی ہند کے قطبی کا کلام دکھنی قطبی سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ دکھن کا قطبی جو قطب شاہی دور سے تعلق رکھتا ہے گولکنڈہ کا رہنے والا تھا اور سلطان محمد قطب شاہ کے عہد سے وابستہ تھا۔ اس کی تصانیف میں تحفۃ النصائح کا دکھنی ترجمہ بہت مشہور ہے۔

"تحفۃ النصائح" فارسی زبان میں ہے اور شیخ یوسف دہلوی کی تصنیف ہے شیخ یوسف حضرت خواجہ نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی کے مرید تھے۔ قطبی نے ۱۰۴۶ھ میں شیخ یوسف کے تحفۃ النصائح کا دکھنی زبان میں ترجمہ کیا۔ ذیل میں اس کے دکھنی ترجمہ کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

؎۱ اردو شہ پارے جلد اول صفحہ ۱۹۷ و صفحہ ۱۹۸

بیوی کا انتخاب

جو لک سنبھالیا جائے تجھ عورت سوں ملنے صبر کر
آفت بلا و کر غم جفا عورت ملایاں توں اگر
جوں جا صبوری زن کرے کر خوبصورت پارسا
ساتی ہو تجھ بھاتی چلے خدمت کرے شام و سحر

جو توں ناری کرے دہند چار چیز اپنے سے کم
سن ذات قد بچتے تلیں چوتھا سو کیا دہن مال زر

کرتے ہو موٹے زن نکو تپلے ہوا و نچے خوف نہیں
ہور کالی زن ہرگز نہ کر فرزند جنے گی بدتر
ہنسنے دیو نہاری نکر ہوا بال جس نینڈریا یہ ہیں
ہور مال ونتی بھی نکو ہوے دہیٹ مکھڑی زشت تر

جنیدی "اردو کے قدیم" کے مصنف نے اس کا نام شیخ احمد لکھا ہے مگر "اردو شہ پارے" کے مصنف کے خیال میں اس کا نام علی اکبر جنیدی تھا۔ انھوں نے اپنے خیال کی تائید میں شاہ عبداللہ کی سوانح کے دیباچہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جنیدی نے قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ دونوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ ایک مثنوی "ماہ پیکر" کا مصنف تھا۔ مثنوی ماہ پیکر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں لکھی گئی اور ۱۰۶۲ھ میں اختتام کو پہونچی۔ ذیل میں بطور نمونہ اُس کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

انارال کے جھاراں کلیاں بار تھے
کہ لالی ہیں یا قوت کے سار تھے

کر آئے تھے جھاراں کو نار بار
رسیلے نکالے تھے جوبن کے ہار

سو چولی تمن بات ان کے اوپر
رکھے تھے چھپا کر سو ان کے بہتر

ابن نشاطی ابن نشاطی نہ صرف قطب شاہی شعراء میں بلکہ تمام دکھنی شاعروں میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ مگر شاعر کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ اُس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ کاش میں بادشاہ کے درباری شعراء میں ہوتا تو شعر و ادب کی دُنیا میں بعض انمٹ نقوش ثبت کر جاتا۔ اُس نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا نثر نویسی سے کی مگر مثنوی گو کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ "پھول بن" اُس کی مشہور مثنوی ہے۔

...... یہ مثنوی طبع زاد نہیں ہے بلکہ ایک فارسی قصہ "بساتین" کا منظوم ترجمہ ہے۔ مگر ترجمہ ہونے کے باوجود طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ابن نشاطی نے لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے بامحاورہ اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ ادبی حیثیت سے بھی یہ بہت اونچی مثنوی ہے۔ زبان کی شستگی، روانی اور بیان کی قدرت قابل تعریف ہے واقعات کی عکاسی بہت صحیح اور فنکارانہ طریقہ سے کی گئی ہے۔ اُس عہد کی معاشرتی تصاویر دیکھنے کے لئے مثنوی پھول بن ایک نادر "تصویر خانہ" ہے۔

ذیل میں اس مثنوی کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا
نہ تھا پروا اُسے کچھ مال و دھن کا

تجارت کی بھوت سوراَت سوں دو
گیا یک مرتبہ گجرات کوں سو

تھا میں اس سفر میں اس کے سنگات
گھڑیا سو کیا کہوں اس ٹھکار پر گھات

۱؎ دکن میں اُردو صفحہ ۲۴۳

مری اُس وقت تھی اوّل جوانی ۔۔۔ نوی اُپڑی تھی مج کوں شادمانی
اتھی اُس ٹھار یک زاہد کوں بیٹی ۔۔۔ فرشتہ خوی تس عابد کوں بیٹی
چتر، چنچل، سرک، کنٹھل سُہانی ۔۔۔ نہ اس کوں کوئی تھا صورت میں ثانی
چندر آدھا کہوں میں کیوں پشانی ۔۔۔ چندر آدھا نہیں ویسا نورانی
بھنواں کے کیوں کہوں محراب تھے کر ۔۔۔ کہاں دو نور محراباں کے اوپر
نین کوں نرگساں کہنا ہے ناساز ۔۔۔ چمن کے نرگساں میں کاں ہے دو ناز
کہوں رخسار کو کیوں اُس کے لالا ۔۔۔ ہر اک لالے کے درمیانی ہے کالا[1]

طبعی

طبعیؔ عہد عبداللہ قطب شاہ کا شاعر تھا مگر اس نے ابوالحسن تاناشاہ کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ اُسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کے ایک مقتدر بزرگ شاہ راجو حسینی سے بہت عقیدت تھی۔ طبعیؔ ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا مصنف ہے۔ یہ مثنوی، نظامی کی ہفت پیکر سے ماخوذ ہے۔ اس میں ایران کے ساسانی خاندان کے چودہویں بادشاہ بہرام گور کی زندگی کے حالات و واقعات اور اُس کی رودادِ عشق نظم کی گئی ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی۔ اور طبعیؔ کے اپنے بیان کے مطابق اس کی تصنیف میں چالیس روز لگے۔

کیا ہوں ایے چالیس دن میں کتاب ۔۔۔ بہوت فکر کر رات دن بے حساب

باوجودیکہ اس مثنوی کی تصنیف میں نظامی کی مثنوی سے استفادہ کیا گیا ہے بلکہ کسی حد تک ترجمہ بھی۔ مگر یہ امر طبعیؔ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا شاہد ہے کہ اُس نے اپنی مثنوی میں ایک جگہ بھی ترجمہ کا رنگ نہیں پیدا ہونے دیا۔ اُس کی مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قادرالکلام شاعر تھا۔ اُسے اپنے الفاظ اور خیالات دونوں پر قابو تھا۔ اُس نے اپنی مثنوی کے مختلف عنوانات کی تقسیم اور اشعار کی ترتیب سے اپنے خوش سلیقہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ذیل میں

---

[1] اردو شہ پارے جلد اول ص ۲۲۷

مثنوی بہرام و گل اندام کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

بہرام کا سوال

ہوا مجنوں برہ تے سدہ گنوا میں | اتھا دانا سو دیوانہ ہوا میں
تجھے دل میں چھپایا ہوں الیس کے | خرابے میں لگایا ہوں دیوا میں
اچایا ہوں ترے غم کے پھاڑ ال | عجب ہے نین سینا پھٹکر ہوا میں
صنم تیرے بدل ہو کر برہمن | گلے میں اپنے بندھایا جنوا میں
منجے کیا دیکھتی از مان گل اندام | پرانا ہوں نہیں عاشق نوا میں

گل اندام کا جواب

تجے حاصل نہیں ہے مجہ تے بن غم | نکو کر غم ہیں اپنا پانو ں کم
ترا دل ہو گیا پھوڑا دو کھوں تے | نہیں اس زخم کا منج پاس مرہم

امین اگول کنڈہ اور بیجاپور میں امین تخلص کے کئی شاعر گذرے ہیں۔ وہ امین جس کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ "قصہ ابو شحمہ" اس کی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں حضرت عمرؓ بن خطاب کے بیٹے ابو شحمہ کے حسن و جمال، خوش گلوئی، ان کی بیماری، پھر صحت یابی، انھیں ایک شخص کا جبراً شراب پلانا، نشہ کی حالت میں ایک عورت کی جبراً عصمت دری، عورت کا حاملہ ہو جانا۔ بچہ کی پیدائش، حضرت عمر کے پاس شکایت پہونچنا۔ ابو شحمہ پر شرعی حد جاری ہونا۔ کوڑوں کی سزا تجویز ہونا اور کوڑے لگنے کی حالت میں ابو شحمہ کا فوت ہو جانا یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اس واقعہ کی تاریخی حقیقت کیا ہے یہ حقیقت افسانہ یہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ امر بھی متنازعہ فیہ ہے کہ سلطان عبد اللہ

کے عہد سے تعلق رکھنے والا امین اصل فارسی قصہ کا مصنف ہے، اور سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے عہد سے تعلق رکھنے والے امین نے اسے دکھنی میں ترجمہ کیا؟ بہرحال اس بحث سے قطع نظر "ابو شحمہ" میں سے چند شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ؎

سنیا ہوں کتاباں میں نہایت خبر ۔۔۔ ھی احمد کی بعد اندر وایت دیگر
کہ ھی نام ان کا دنیا انکوں پناہ ۔۔۔ جو کوئی ناؤں لیو توں جاوی گناہ
اگر ھوی نبی کا کرم جس اوپر ۔۔۔ خدا کا بی رحمت ھوی اس اپر
ابا بکر بعد از خلافت کیا ۔۔۔ او ساری خلق پر عدالت کیا
عمر ابن خطاب عادل ھوی ۔۔۔ کہ سب عالماں میں او فاضل تھے

عمر کوں جو اس وقت فرزند یک ۔۔۔ خدا نے دیا تھا او دل بند ایک
اتھا حسن میں جو نک او آفتاب ۔۔۔ کہ روشن ہوا کستی یو ماہتاب
عجب خوبصورت او دلدار تھا ۔۔۔ عمر کا جو اس پر بڑا پیار تھا
ابو شحمہ سو ناؤں اس کا دکھی ۔۔۔ دنیاں میں نہیں تو کوئی ویسا سکھے

امین کی مثنوی کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ زبان و بیان کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں کوئی بہت اونچا مقام نہیں رکھتا تھا، باوجودیکہ طبعی بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کی زبان، طرزِ ادا کی جدت اور تشبیہات کا استعمال نہ صرف یہ کہ قابلِ تعریف ہے بلکہ بہت سے متقدمین و متاخرین سے بھی اعلیٰ ہے۔ امین نے اپنی مثنوی میں کسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ وہ دکھنی شاعری کی تاریخ میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا ہے اس نے ایک دلچسپ افسانہ منظوم کیا ہے

بد ڈھال کر دکھنی زبان میں پیش کیا۔ بلا شبہ یہ ایک اضافہ ہے اور اس سے ابنِ کا مقام متعین ہوتا ہے۔

سلطان ابوالحسن تاناشاہ

سلطان ابوالحسن تاناشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا۔ اور اُس کی وفات پر ۱۰۸۸ھ میں مسند آرائے حکومت ہوا تھا۔ جہاں بانی و جہانگیری سے زیادہ علم و ادب اور تصوف میں دلچسپی لیتا تھا۔ خود شعر کہتا تھا اور شعرا کی بہت قدر دانی کرتا تھا۔ اس کے عہد کے شعرا میں فائز، لطیف، نوری، شاہی، مرزا، غلام علی، سلوک، شعور اور بیجارہ، افضل، نوری اور راجو شامل ہیں۔ ابوالحسن تاناشاہ کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ قطب شاہی سلطنت کا چراغ بھی گل ہوگیا اور جنوبی ہند کا یہ حصہ سلطنت مغلیہ کا جزو بن گیا۔ تاناشاہ کی باقی ماندہ زندگی قید و بند کی حالت میں بہت بیچارگی اور بے کسی کے ساتھ بسر ہوئی۔ شاید اس لئے کہ تاناشاہ کا عہدِ حکومت جنگ و جدل کی نذر ہوگیا۔ اور اُس کی زندگی کا باقی حصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گذرا۔ وہ اپنا دیوان مرتب نہیں کر سکا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے شعر کہے ہی نہیں۔ اُس نے شعر تو یقیناً کہا چنانچہ مندرجہ ذیل شعر مرزا لطف اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں تاناشاہ سے منسوب کیا ہے۔

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ بھل جھراٹ ہے
ایک بات کے ہوں گے سخن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

اس شعر کے سوا تاناشاہ کا اور کوئی شعر ہم تک نہیں پہونچ سکا۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اس شعر پر اس کا ذکر ختم کر کے اس کے عہد کے دوسرے شعرا پر روشنی ڈالیں۔ تاناشاہی عہد کے شعرا کی پیدائش و وفات کی تاریخیں نہیں مل سکیں اس لئے اُن کی مشہور مثنویوں کے سنِ تصنیف کی ترتیب سے اُن میں سے صرف قابلِ ذکر

لوگوں کا ذکر کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس کتاب کی ضخامت اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

غلام علی مثنوی "پدماوت" کا مصنف غلام علی سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے عہدِ حکومت کا مشہور شاعر تھا۔ پدماوت کو اس نے دکھنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اصل قصہ کا مصنف ملک محمد جائسی ہے جس نے شیر شاہ سوری کے حکم سے ۹۴۷ھ میں اسے بھاکا زبان میں قلم بند کیا تھا۔ بھاکا سے یہ قصہ فارسی میں منتقل ہوا۔ اسے فارسی نظم کا لباس پہنانے والوں میں ملا عبدالشکور بزمی اور عہدِ عالم گیر کے گورنر عاقل خاں رازی اور فارسی نثر کا لباس پہنانے والوں میں ایک شخص چھمی رام اور نواب ضیاء الدین احمد خاں لوہارو شامل ہیں۔ بزمی نے ۱۰۲۸ھ میں اور عاقل خاں نے ۱۰۹۹ھ میں اس قصہ کو فارسی رنگ دیا۔ اس کے علاوہ یہ قصہ پشتو، ہندی اور اردو زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا۔[1]

غلام علی نے اسے ۱۰۹۱ھ میں تصنیف کیا۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام علی اپنے عہد کا باکمال شاعر تھا۔ اس کا اسلوب گو زیادہ دلکش نہ سہی لیکن ابنؔ کے مقابلے میں بہتر ہے اس کی زبان کہیں کہیں زیادہ صاف نہیں ہے۔

اپنے ہر بیان کے خاتمہ پر اس نے جو نتائج نکالے ہیں وہ جہاں اس کے تجربات کا نچوڑ ہیں وہاں اس کی ذہنی کیفیات اور اس کے نظریات و خیالات کا بھی پتہ دیتے ہیں۔

ذیل میں اس کی مثنوی میں سے کچھ شعر بطور نمونہ ... نقل کئے جاتے ہیں۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۳۰ و ۱۱۹ و ۱۱۸

اتھا ایک راجا سو بہو کن گنبھیر | شکل دیب کے ملک میں ہے بے نظیر
نگانا دل کند روپ حسین اتھا | جگت میں برار اچ اس بن نتھا
نہ تھا کو تچ لشکر کوں اُس کی حساب | کہ جوں گہن پہ تاریاں نسی ماہ تاب
خزینہ بھری کو ٹھریاں کئی ہزار
جواہر کی صندوق تھی سو ہزار

شعری نتائج

غلام علی کہہ بھلا ہر کسے — برا کہنے سوں جگ میں دشمن دسے
بھلائی ستے توں بھلا پائے گا — برائی سوں سر پر بلا لیائے گا
ہووے کوئی براتوں بھلائی نچھوڑ — برا بول کس کوں اپس موں نہ توڑ

سیوک سیوک بھی ابوالحسن تانا شاہ کے عہدِ حکومت سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی تصنیف مثنوی جنگ نامہ کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ جنگ نامہ طبع زاد مثنوی نہیں ہے بلکہ ایک خیال کے مطابق محمد عاشق کے قصہ محمد حنیف کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر بیلی نے اسے ابوالقاسم مرزا کی تصنیف قرار دیا ہے۔ مگر موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی معقول دلیل نہیں دی ہے۔ اسی لئے ہم اُن سے اختلاف رائے کرنے پر مجبور ہیں۔ ذیل میں مثنوی مذکورہ کے کچھ شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

یکایک کہو دیکھوں دین رب کیا — زنگی وار خالی اوپر جب کیا
سبب طاقت کیا رد و وار — کیا جانگر حیدر کا نعرہ پکار
نزدیک جا پھیر پاشاہ دانشمند — زنگی کی کمر کا پکڑ کمر بند
لیا دین و جا تریں ہیں نی اوپار — پھرا اسکوں کر کر زمین پر پچھار
زنگی کوں ضرب سو بھاری دیا — بیسے استخوان اس کی سر بان کیا

فائز تانا شاہی دور کا با کمال شاعر تھا۔ مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس نے از راہِ خاکساری

اپنی ہیچمدانی کا اظہار کیا ہے لیکن اُس کی مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اُس کے طرزِ ادا میں بڑی حد تک کشش ہے۔ اُس دور کی عام روش سے ہٹ کر اُس نے اپنی مثنوی میں عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ جذبات نگاری میں فائز پہلو سے سبقت لے گیا ہے۔ ذیل میں مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" میں سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔ روح افزا، رضوان شاہ کے پیامبر کو اپنی داستانِ درد سنا رہی ہے۔

ولے شاہ کا دیکھ دیدار میں — پلک زد منے ہوئی گرفتار میں
مرے دل منے سوز پیدا ہوا — درد عشق کا دیں ہویدا ہوا
یں باتاں منے گرد بڑانے لگی — مری جیب بھی ٹوٹ پھٹانے لگی
مرے موں پو کی لالی اشتابی گئی — مری بھوک بھو نیچ نشتابی گئی
اگر سچ کہوں اب بھی بے سدھ ہوں میں — مجھے اپنے گھر میں بھی آرام نہیں
مری نین کوں نیند ہوی ہے حرام — بغیر شاہ کا یاد نہیں مجھ کوں کام
نہ اس درد میں کوئی سنگاتی ہے مجھے — نہ کس کی رفاقت بھی بھاتی مجھے
اد پر خوش ہوں تکتی ہوں باطن میں یں — بہوت دو کہہ دیکھی اس نھم و سن میں یں
مجے وقت گمتا نہیں ایک ٹھار — پکڑتا نہیں ٹک مرا دل قرار

لطیف — ان کا نام غلام علی خاں تھا۔ لطیف تخلص کرتے تھے مثنوی "ظفر نامہ" انھیں کی تصنیف ہے جو ساڑھے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ "دکن میں اُردو" کے مصنف نے اپنی تصنیف کے صفحہ ۸۶ پر لطیف کو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر قرار دیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں اُن کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ لطیف نے دو بادشاہوں کا زمانہ پایا تھا۔ ایک

لہ اردو شہ پارے صفحہ ۲۵۱

سلطان عبداللہ قطب شاہ کا اور دوسرا سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا مگر اسے عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے عہدِ حکومت میں موجود ہی نہیں تھا، جو واقعاتی اعتبار سے غلط ہے۔ کیونکہ اُس کی مثنوی "ظفر نامہ" جو اس کی شہرت کا اصل سبب ہے ۱۰۹۵ھ میں تصنیف ہوئی اور یہ زمانہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا تھا۔ قطب شاہ ۱۰۸۳ھ میں اور ایک خیال کے مطابق ۱۰۸۳ھ میں فوت ہو گیا تھا۔ ۱۰۸۳ھ یا زیادہ سے زیادہ ۱۰۸۳ھ سے ۱۰۹۸ھ تک کا زمانہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا عہدِ حکومت شمار ہوتا ہے۔ اس لئے لطیف کو صرف عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت کا شاعر قرار دینا تاریخی اعتبار سے بھی غلط ہے۔ بات وہی صحیح ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے یعنی اُس نے دونوں بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔

اس کی مثنوی "ظفر نامہ" خالص مذہبی مثنوی ہے جس میں حضرت علیؓ کے فرزند محمد حنیف اور آپ کے رفقائے کار کی یزید اور اُس کے ساتھیوں سے جنگ کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بیشتر تاریخی اعتبار سے غلط ہیں۔ اس مثنوی کی ادبی حیثیت نہ صرف یہ کہ مشتبہ ہے بلکہ سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ ساری نظم انتہائی غیر دلچسپ ہے۔ طرزِ ادا میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔ زبان بھی اس دور کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں ناہموار ہے۔ سلاست اور روانی نام کو نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے محض حصولِ ثواب کے لئے یہ نظم لکھ دی۔ البتہ اس کی پُرگوئی کا ضرور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ذیل میں اس نظم کے بعض شعر درج کئے جاتے ہیں۔

جنگ کا سین

جب کفار کا صف نمودار ہوا | تب اسلام کا تیز تروار ہوا
ادھر تے فرنگی دوزنگی کدہنک | خبردار ہو پیک کر ساز جنک
سکل ٹوپیاں پین ہیں ہوداسری | بنداسب خراں تیں سری پاکری
فرنگی سو باجا وسے وہات کا | بجلتے جون وجال کمندات کا
دمامہ سو جون فیل کہ کو زیتون | نفیری سو جون جغد کہ سوزیتون[۱]

نوری — ان کا نام سید شجاع الدین تھا۔ گجرات (جنوبی ہند) کے رہنے والے تھے۔ ترک وطن کر کے حیدرآباد آ گئے تھے۔ اور یہیں سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے وزیر اعظم سید مظفر کے بچوں کی اتالیقی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ نوری مرثیہ گو شاعر تھے۔ اُن کے مرثیہ کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے لوگوں میں سے سب سے اچھی صاف اور شستہ زبان لکھتے تھے۔ ذیل میں اُن کے مرثیہ کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا | ولے سب تعصب دیا ہم ہٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا | وہم مرثیے سے بہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعات | وہم تک احوال پورا لکھا
ہیں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا | عجب حال عاشور خانے میں تھا
جن وانس کرتے تھے سب واہ واہ | دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیہ
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا | کبھی اس سے پہلے سنا نے پڑھا

اماماں سے اس کا ملے گا صلہ
کہ ہے نوری ہی موجد اس طرز کا[۲]

۱؎ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۴۰ ۲؎ داستانِ اردو

عہدِ قطب شاہی کے نثر نگار

قطب شاہی عہد میں صرف نظم ہی پروان نہیں چڑھی بلکہ نثر کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ اس عہد کے پہلے دو نثر نگار مولانا عبداللہ اور شاہ میراں جی مذہبی خیالات کے سختی سے پابند تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو نثری شاہکار تخلیق کئے وہ خالصتاً مذہبی نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے۔ پند و غظ اور اخلاقیات کا بیان ان نثری شہ پاروں کی اصل خصوصیت ہے۔ ذیل میں اس عہد کے نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی اور ان کے نثری شاہکار کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

شاہ میراں جی

شاہ صاحب حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ سید میراں حسینی کے نام سے بھی متعارف تھے۔ اپنے زہد و تقویٰ اور نیک نفسی کے لئے مشہور تھے۔ بیجا پور کے ایک بزرگ شاہ امین الدین اعلیٰ سے بیعت تھے سلطان عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ پایا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے خیال میں ان کا سنہ وفات سنہ ۱۰۴۳ھ ہے۔

شاہ صاحب کے نثری کارناموں میں "شرحِ تمہید ہمدانی" قابلِ ذکر ہے۔ یہ عین القضات ہمدانی کی تصنیف "تمہیداتِ عین القضات" کا دکھنی ترجمہ ہے۔ ذیل میں اُس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"اے عزیزاں[1]، اے بات نہیں سنیاں، بادشاہ گھوڑا استعدگی باغ

---

[1] خبر

نہیں سوار ہوتے، ہور گھوڑے میں کچ[1]، گھوڑا[2] اچھے[3] تو بھی نہیں قبول کرتے یعنی پیر کے عشق میں نچا ہوے باج خدا کے عشق ہیں نا اسک سکی ہور[4]۔ دیکھ نا آسک سی[5]۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوق نے میاکن۔ اس کا معنا خدا کی پہچان کا بل نہیں تو اول اپنی پہچانت کرے[6]۔"

مولانا عبداللہ مولانا عبداللہ دکھنی زبان کے ایک مذہبی رسالے "احکام الصلوٰۃ" کے مصنف تھے۔ مولانا نے بھی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ پایا تھا۔ ان کا رسالہ ۱۰۳۲ھ کی تصنیف ہے جو مذہبی احکام کے بیان پر مشتمل ہے۔ ذیل میں اس کا ایک حصہ درج کیا جاتا ہے۔

"روح قبض ہوا۔ اسی وقت اس کیاں انکھیاں موجنا ہوا پاؤں دراز کرنا ہور ہاتھ دراز کرنا دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینے پر نار کھنا۔ ہوا اُس کی ٹھڈی ہوا سر کوں ملا کر بندنا۔ یو سب سنت ہے۔ ہور مرنے تے اول اس کے سر کوں قطب کی طرف سلانا ہور میے بعد از غسل دینا اسی طریق سوں۔"[1]

وجہی حصہ نظم میں ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ وجہی نے نظم میں اپنی مثنوی "قطب مشتری" کے لئے اور وجہی نے نثر میں "سب رس" کے لئے مشہور ہیں۔ "سب رس" سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ "سب رس" وجہی کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ فتاحی کی فارسی کتاب "حسن ودل" کا اُردو ترجمہ ہے۔ "حسن ودل" نثر میں ہے۔ فتاحی نے اس سے پہلے اسے نظم کے لباس میں بھی پیش کیا تھا۔ اس کا نام "دستورِ عشاق" ہے۔ مگر وجہی نے اس میں کسی قدر تصرف بھی کیا ہے۔ اصل کتاب کی طرح وجہی کے ترجمہ کی عبارت

---

۱ کچھ ۲ عیب ۳ ہوئے ۴ نہیں آسکتا ہے ۵ اور ۶ داستانِ تاریخ اردو ص ۳۸-۳۹

بھی مقفیٰ و مسجع ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل قصے کے رنگ میں بیان کئے گئے ہیں اور بعض انسانی صفات اور انسانی طاقتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اُردو کی طرف سے اسے چھاپ کر شائع کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"ایک شہر تھا۔ اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل، دین و دُنیا کا تمام کام اس نے چلتا۔ اس کے حکم کے باج ذرا کیں نہیں ہلتا۔ اس کے فرمانے پر جنو چلے، ہر دو جہاں میں ہو سکے بھلے، دُنیا میں خوب کہوائے، چار لوگوں میں عزت پائے۔"

میراں یعقوب میراں یعقوب ایک دکھنی نثر کی کتاب "شمائل الاتقیا" کے مصنف تھے۔ "شمائل الاتقیا" دراصل اورنگ آباد کے ایک بزرگ برہان الدین اولیا کی تصنیف ہے۔ جس میں مذہب اور اُس کے متعلقات کا بیان ہے۔ میراں یعقوب نے اسے ۱۰۶۸ھ میں دکھنی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

"ذکرِ معجزہ و کرامت۔ ہور ولیاں کوں کرامت ہے کہ اینو[1] پورا علم دھرتے ہیں ولے مغلوب ہور بیخود ہیں۔ جیکچھ[2] اینو کتے ظاہر ہوتا ہے سو اسے کرامت کہتے ہیں۔ ایا معونت او[3] ہے جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دھرتے ہیں انو[4] تے کچھ فرق عادت یعنی کدھی[5] نہیں ہوتا ہے سو چیز[6] ظاہر ہوتا ہے۔"

---

[1] یہ لوگ [2] جو کچھ [3] وہ ہے [4] اُن [5] کبھی [6] داستان

تاریخ اُردو صہ ۴۲

قطب شاہی نظم و نثر پر تبصرہ

گذشتہ صفحات میں قطب شاہی نظم و نثر اور ان سے پیوستہ صفحات میں بہمنی نظم و نثر کے نمونے پیش کئے جا چکے ہیں شاعروں اور نثر نگاروں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی بیان کئے جا چکے ہیں اور گنجائش کے مطابق ان ہر دو ادوار کی نظم و نثر کے بعض حصوں پر تنقید و تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے۔ یہاں اجمالاً یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ بہمنی عہد کے شعرا اور نثر نگاروں نے اُردو نظم و نثر کی پرورش کے لئے جو قدم اُٹھایا تھا۔ قطب شاہی دور کے اہلِ قلم نے اسے اور آگے بڑھایا۔ اس میں شک نہیں کہ بہمنی عہد میں دکھنی نظم و نثر کی جو ابتدا ہوئی تھی وہ کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں تھی۔ نثر کا اسلوب زبان صاف نہ ہونے کی وجہ سے بہت بھونڈا تھا۔ الفاظ کی تراش خراش کی طرف بھی قطعاً توجہ نہیں دی گئی تھی کیونکہ اُس دور کے نثر نگار مذہبی لوگ تھے۔ اُن کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اسلامی تعلیمات کو لوگوں میں عام کیا جائے۔ زبان کو بنانا اور اسلوب کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرنا اُن کے دائرہ عمل سے خارج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "معراج العاشقین" ہو یا "سہ بارہ" اس دور کی کوئی کتاب ادبی نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھی گئی۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس دور کی تصانیف طبع زاد نہیں ہیں بلکہ ترجمہ کی گئی ہیں اور ترجمہ بھی مذہبی کتابوں کا اس لئے بھی اُن میں ادبی رنگ نہیں پیدا ہو سکا۔ تقریباً یہی کیفیت قطب شاہی دور کے نثر نگاروں کی ہے۔ اس دور کے جن نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کے سب مذہبی لوگ تھے بلکہ اُن میں سے بعض تو پیری و مریدی کے سلسلے سے بھی وابستہ تھے۔ ان لوگوں نے بھی جس قدر تصانیف کیں اُن پر بھی پند و وعظ کا رنگ غالب ہے مگر یہ ضرور ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے اس دور کی نثر بہمنی عہد

کی نثر سے بہتر ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے الفاظ پر سے وہ اثرات زائل ہوتے نظر آتے ہیں جنھوں نے بہمنی دور کی نثر کو بعید از فہم بنا دیا تھا۔ اظہار خیال کا انداز بھی نسبتاً بہتر اور موثر ہے خصوصاً مولانا عبداللہ کی کتاب "احکام الصلوٰۃ" اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ وجہی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنا نثری شاہکار "سب رس" پیش کر کے بہمنی اور قطب شاہی نثر کا فرق واضح کر دیا۔ وجہی وہ پہلا نثر نگار ہے جس نے اردو نثر میں قصوں کو داخل کیا اور واعظانہ انداز کو گوارا بنانے کے لئے اسے افسانے کا رنگ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وجہی نے بھی اپنی "سب رس" میں تقریباً وہی مذہبی مسائل بیان کئے ہیں جو اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے بعض انسانی خصائص پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا اسلوب بہمنی نثر نگاروں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہے۔

تقریباً یہی حال نظم کا بھی ہے۔ بہمنی عہد میں نظم کا سرمایہ بہت محدود تھا۔ کچھ ابیات خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اور ایک مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" نظامی کی ہے۔ ان کی زبان و بیان اور الفاظ کی تراش خراش کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ کیونکہ نثر کے ضمن میں اس دور کی زبان اور الفاظ کی تراش خراش پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ البتہ نظامی کی مثنوی کے متعلق یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس مثنوی کے مصنف کے سامنے اس سے پہلے دکھنی مثنوی کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا یا اسے جس طرح ترتیب دیا محض اپنی ذہنی اپج کا سہارا لیکر اور طبع سلیم کی رہنمائی میں۔ اس کا قصہ بھی ترجمہ نہیں ہے بلکہ طبع زاد ہے یہ امر بھی اس کے ذہن کی خلاقی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد جب ہم قطب شاہی عہد کی طرف آتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد میں اردو نظم نے

بہت حد تک ترقی کی۔ بہمنی عہد کی اردو شاعری کے سرمایہ میں ہمیں کچھ ابیات اور ایک مثنوی کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا ہے قطب شاہی عہد میں غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ اور دوسری نظموں کا وسیع ذخیرہ جس میں موسمیات و مناظر قدرت سے لے کر مختلف میلوں، تہواروں اور تقریبات، غرض زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر شعبہ کی عکاسی اور ترجمانی ملتی ہے بالفاظ دیگر اس دور میں اردو شاعری کے موضوعات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کے شاعروں کی زبان بھی نسبتاً صاف ہے۔ اسلوب اور طرز ادا میں بھی ترقی ہوتی نظر آتی ہے۔ الفاظ کی تراش کی طرف بھی کافی توجہ دی گئی ہے۔

سلطنت عادل شاہی۔ اور اردو

سلطنت عادل شاہی کا بانی یوسف تھا جو عادل شاہ کے لقب سے سریر آرائے مسند ہوا تھا۔ عادل شاہ ترکی کے فرماں روا سلطان مراد کا بیٹا تھا۔ سلطان مراد کے انتقال کے بعد جب اُس کا سب سے بڑا بیٹا سلطان محمد تخت نشین ہوا تو اُس نے بعض امرائے دربار کے مشورے سے اپنے بھائی یوسف کو قتل کروا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ماں کی ممتا نے جوش مارا اور اُس نے ایک ایرانی سوداگر خواجہ عماد سے مل کر یوسف کو اُس کے ساتھ پوشیدہ طور پر ایران بھجوا دیا۔ کچھ عرصہ ایران میں رہنے کے بعد خواجہ عماد اور یوسف دونوں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ یہاں پہونچ کر یوسف محمد شاہ بہمنی کی فوج میں ملازم ہو گیا مگر اپنی قابلیت اور مستعدی سے ترقی کرتے کرتے جنیر کے صوبیدار کے مرتبہ تک پہونچ گیا۔ اس کے بعد عرصہ تک افواج بیجاپور کا سپہ سالار بھی رہا۔ اور عادل خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔ اسی دوران میں محمد شاہ بہمنی کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے انتقال کے ساتھ ہی بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ہر طرف انتشار اور بدامنی پھیل گئی۔ یوسف نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا۔ امرا سے تعلقات استوار کئے۔ سپاہیوں اور افسروں کے ساتھ بہت مشفقانہ برتاؤ کیا۔ اس طرح جب اس کی طاقت مضبوط ہو گئی اور فضا اُس کے حق میں سازگار ہو گئی تو ~~۸۹۵ھ~~ ۸۹۶ھ میں اُس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور بیجاپور کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہی وہ

ہے جو تاریخ میں یوسف عادل شاہ کے نام سے مشہور ہوئی اور جسے عادل شاہی سلطنت کا بانی قرار دیا گیا۔

سلاطین عادل شاہی کی علم دوستی اور اُردو نوازی

اس خاندان نے تقریباً دو سو سال حکومت کی۔ اس میں نو بادشاہ گذرے جن میں سے بعض بہت ہی عالی حوصلہ علم پرور، شعر و سخن کے دلدادہ اور خود بھی شاعر تھے۔ یوسف عادل شاہ اور اُس کا جانشین اسماعیل عادل شاہ دونوں فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اسی خاندان کا ایک بادشاہ علی عادل شاہ اپنی علم دوستی، علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کی قدردانی اور سرپرستی کے لئے آج تک مشہور ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں ہندوستان اور ایران کے بکثرت اہلِ علم جمع ہو گئے تھے۔ وہ خود بھی اُن کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا اور ہفتہ میں تین بار انھیں اپنے دربار میں بلا کر مجلسیں منعقد کرواتا تھا۔

علی عادل شاہ کا جانشین ابراہیم ثانی کا عہدِ حکومت اس اعتبار سے تاریخ ہندوستان کا زرین دور کہلاتا ہے کہ اُس کے زمانے میں سلطنت بیجاپور علم و فضل کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ نے اسی بادشاہ کے حکم سے ہندوستان کی وہ شہرۂ آفاق تاریخ لکھی جو آج بھی "تاریخ فرشتہ" کے نام سے مورخین کی رہنمائی کرتی ہے۔ ملا ظہوری جو فارسی زبان کا غیر فانی شاعر اور ادیب تھا اسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ ملک قمی، ملا رفیع الدین شیرازی اور شیخ علیم اللہ جیسے علماء اور اہلِ قلم اس بادشاہ کے دربار کے رونق تھے۔ غرض یہ اور اُن کے بعد کے عادل شاہی بادشاہوں کی اکثریت بہت علم دوست اور ادب نواز تھی۔

اس خاندان نے اُردو نظم و نثر کی ترویج و ترقی کے لئے بھی بعض بہت ہی حوصلہ افزا قدم اُٹھائے اور انہی ادب نوازی کی وجہ سے لوگوں کو اس میدان میں قدم رکھنے اور آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ اس خاندان کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نہ صرف اہلِ کمال کا قدردان تھا بلکہ خود بھی فنونِ لطیفہ میں دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کے پیش رو بادشاہ کے عہد میں سرکاری زبان فارسی قرار دیدی گئی تھی مگر یہ اس کی اُردو نوازی کی اعلیٰ ترین مثال ہے کہ اس نے پھر سے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا ابراہیم عادل شاہ شعر اور موسیقی دونوں پر بہت گہری نظر تھی۔ ہندوستانی موسیقی کا ماہر تھا۔ اس فن پر "نورس" کے نام سے دکھنی نظم میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

اسی خاندان کے ایک اور بادشاہ علی عادل شاہ ثانی کا زمانہ بھی اُردو زبان و ادب کیلئے نہایت امید افزا ثابت ہوا۔ علی عادل شاہ کو اُردو سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی اُس کا نتیجہ تھا کہ اس کے عہد میں دکھنی اُردو کے بکثرت شاعر پیدا ہوئے جن کی دربار شاہی سے بہت حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس بادشاہ کے زمانے میں فارسی عربی کی بعض قابلِ قدر کتابوں کے دکھنی اُردو میں ترجمہ بھی کئے گئے جن میں سے ملا جامی کی "یوسف زلیخا" کا ترجمہ خاص طور سے مشہور ہے۔ "روضۃ الشہدا" کا دکھنی ترجمہ بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ ترجمہ کرنے والوں میں نصرتی بیجاپوری اور بعض دیگر شعرا (جن کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا) قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب لوگوں کو دربار شاہی کی طرف سے ان کی محنت کا معاوضہ بھی دیا گیا۔ اس طرح جہاں اُن کی حوصلہ افزائی ہوئی وہاں وہ فکرِ معاش کی طرف سے بھی آزاد ہو گئے۔

اسی خاندان کا آٹھواں بادشاہ علی عادل شاہ ثانی اپنے زمانہ کا باکمال

شاعر تھا۔ اس کی وجہ سے سلطنت بیجاپور میں شعر و ادب سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اور شعراء کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس کے دربار سے بہت سے شاعر وابستہ تھے۔ اسے شاعروں کا بہت بڑا مربی اور سرپرست سمجھا جاتا تھا۔

اب ذیل میں عادل شاہی عہد حکومت کے قابل ذکر شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کا کلام اور اس پر تنقید و تبصرہ بھی کیا جائے گا تاکہ قارئین کتاب اس دور کی نظم و نثر کے سرمایہ کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حسن و قبح سے بھی باخبر ہو جائیں۔ پہلے شاعر بادشاہوں کا ذکر کیا جائے گا اور پھر عادل شاہی سلطنت کے عام شعراء کا از ابتداء تا انتہا۔ مگر صرف قابل ذکر لوگوں کا۔

عہد عادل شاہی کے شعرا

ابراہیم علی عادل شاہ اول کے انتقال کے بعد ۹۸۸ھ میں سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی سریر آرائے مسند حکومت ہوا۔ اس کے عہد حکومت اور علم و ادب سے شیفتگی کے متعلق گذشتہ صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سلطان موصوف دکھنی اردو کا خوش گو شاعر تھا۔ ابراہیم تخلص کرتا تھا۔ اس کی منظوم تصنیف "نورس" فن موسیقی کے اصول و قواعد پر ایک بلند پایہ تصنیف سمجھی جاتی ہے یہ کتاب گیارھویں صدی ہجری کے ابتدائی دس سالوں میں سے کسی ایک سال کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ "نورس" پر اس عہد کے برعکس دکھنی سے زیادہ ہندی زبان کے اثرات ملتے ہیں۔ بلکہ ان کی کثرت ہے۔ کہیں کہیں فارسی اور بعض جگہ دکھنی زبان کے الفاظ بھی ہیں۔ اس نظم کا اسلوب قابل داد ہے۔ ذیل میں سلطان موصوف کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

سید محمد پتی پیرا | جیوں رتن میں اتم ہیرا
محل محل صدر سنوارے | اس نمونے بہشت اپارے
انند ہوتا ہے سدا بہارے | ارتیا سیائی ابر بھرتا رے
شمالی عنبر بتیاں پھیر آئے | شربت گھول عربت پلائے
بادل دمام بجلیاں بجاوے | باجی خالو آشتابی تے پاوے
سہالفواس کلیاں بدہاوے | ابراہیم گر گن گاوے[1]

شاہی اس کا نام علی عادل شاہ (ثانی) تھا۔ شاہی تخلص کرتا تھا۔ ۱۰۶۷ھ میں تخت سلطنت کا وارث بنا۔ دکھنی اردو کا بلند پایہ اور باکمال شاعر تھا۔ شاعروں کا قدردان اور مربی تھا۔ اس کی والدہ خدیجہ سلطان بھی اردو زبان وادب کی دلدادہ اور سرپرست تھی۔ گویا علم وادب کا ذوق اور اردو کی سرپرستی کا جذبہ اسے ورثہ میں ملا تھا۔ اس کا مذاق بہت ستھرا تھا۔ علوئے خیال اور شستگئ زبان اس کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اس کی شاعری کے سرمایہ میں غزلیں، مثنویاں رباعیاں اور قصائد شامل ہیں۔ ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

غزل

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو | یاقوت ہور مرجان میں کوہی رتن بہتر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے | جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا سادی غزل | منگ جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

قصیدہ

بجے سفید بیں باغ کے تختے گگاں ہر جنس تے کے | خصوصاً تیوں نجانس رہیں یو دسا دے جنجل

---

[1] دکن میں اردو

وہ سو غربت کی نوکنیں رہتے ناریل کے گھر — میٹھے کتی نیر کے چشمے تے بہریا ہے منجل
نارنگی و رنگ کا بہوس دہر لگیا باغ سینے — لنگے تن کون برامر دیکھ ہو لنگ سن لیا سکل

رباعی

سب ڈس لیس گیا ہے دمن تے لڑتے لڑتے — گھٹ رات گئی ہے پانوں پڑتے پڑتے
کیا نیکہ من کا اونچ لگتا ہے بیچ — رہے پانوں سرے پرت کے چڑتے چڑتے

شمس العشاق موصوف جنوبی ہند کے مشہور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ جن کے دامن فیض سے ہزار ہا لوگ وابستہ تھے۔ شاہ میراں جی کے نام سے بھی مشہور تھے۔ آپ نے عادل شاہی خاندان کے بانی یوسف عادل شاہ کا زمانہ پایا تھا۔ ۲۵ شوال ۹۰۲ھ کو فوت ہوئے۔ خدا رسیدہ بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب دکھنی اُردو کے شاعر اور نثر نگار بھی تھے "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے نام سے دو منظوم کتابوں کے اور "شرح مرغوب القلوب" کے نام سے ایک نثر کی کتاب کے مصنف تھے، چونکہ شاہ صاحب صوفی اور ولی تھے اس لئے آپ کا کلام بھی پند و نصائح پر مشتمل ہے۔ ذیل میں آپ کی صرف ایک منظوم تصنیف "خوش نغز" میں سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

بجے ہماری ارادت کی ان کا یہ احکام — نماز تسبیح نیتان ذکر اللہ ایک نام
اس پر جتیا رہو صدق سوں وتا اچھے لاب — دین دنیا دیدار بہشتاں پاویں بے حساب[1]

جانم ان کا نام برہان الدین تھا۔ جانم تخلص کرتے تھے۔ شاہ میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا ابتدائی زمانہ پایا تھا۔ سنہ ۹۹ھ

---

[1] دکن میں اُردو ص ۱۱۴-۱۲

میں وفات پائی۔ اپنے والد مجد کی طرح صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ کلام بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ بعض اشعار کی زبان بہت صاف کلام میں درد ہے۔ ذیل میں اُن کی شاعری کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

نہیں مجھ سیں تہہ لگائے من لقیباری　　　اللہ مجھے عاشق اپنا توں کیتا ہی

اب چھوڑ نین کہوں مت جاوے رے

مجھ برہ جلی کوں مت تو ساوے رے

پیو جانے توں میری من بہاوے رے

آکے جانم جیہ جانے فانی رے　　　جان کی آج ہے جسمانی رے

مقیمی ان کا نام مرزا محمد مقیم تھا۔ مقیمی تخلص کرتے تھے۔ ایرانی النسل تھے۔ تلاشِ روزگار میں ہندوستان آئے اور ابراہیم عادل شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی زبان کے باکمال اور بلند پایہ شاعر تھے مگر دکھنی زبان کی شاعری کا قابلِ ذکر کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس مثنوی میں سندرپٹن کے راجہ کی بیٹی "چندر بدن" اور ایک سوداگر زادہ "مہیار" کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں کوئی قابلِ ذکر خوبی نہیں مگر یہ اس اعتبار سے ضرور قابلِ قدر ہے کہ اس کا مصنف ایک ایرانی تھا جس کی مادری زبان فارسی تھی اور جس نے ہندوستان آکر دکھنی زبان سیکھی اور اس میں ایسی دستگاہ حاصل کر لی کہ ایک طویل مثنوی نظم کر دی جس کی زبان اُس دور کی اردو کو دیکھتے ہوئے نسبتاً صاف ہے وہ حصہ جہاں مہیار اور چندر بدن کے درمیان مکالمہ دکھایا گیا ہے خاص طور پر قابلِ تعریف ہے۔

ٖ۱ رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۲۷ء

* میں کوئی بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکے۔ ان کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" ان کی دکنی شاعری کا

ذیل میں اس مثنوی کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

نزدیک جا کر بولیا کوسن اے پری — تجھے تجھ لطافت دیوانہ کری
دیوانہ ہوں تیرا دیوانے کے تئیں — اپس تے نکو دور جانے کے تئیں
کہتا ہوں تجھے میں کہ اے گن بھری — توں کرنا اتیا کچ مری دلبری
نگار اس سنا کر اُٹھی بول یوں — سمجھ کر تم اپس کوں اے بیڈول توں
ہندو میں کہاں اور ترک توں کہاں — کہاں رام پتیا و ترک توں کہاں
کہاں میں چندرماں کہاں تو دیا — کتا کیا ہوے تو دیوانہ ہوا
بھڑک بول اس کوں دئیں پھر چلی — او تھا دل میں عاشق کے دیں گد گلی[۱]

امین

یہ وہ امین ہے جو سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں گذرا ہے۔ ایک مثنوی "بہرام و حسن بانو" اس کی تصنیف بتائی جاتی ہے مگر یہ مثنوی دولت کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہونچی۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امین اپنے دور کا باکمال شاعر تھا۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عربی قصائد پر بھی پورا عبور رکھتا تھا اور کم از کم امراالقیس کے قصائد کا مطالعہ ضرور کیا تھا کیونکہ ایک مقام پر وہ بھی امراالقیس کی طرح اپنے ہیرو کے ہاتھ سے ہیروئن اور اُس کی سہیلیوں کے کپڑے اس وقت چھپا کر رکھوا دیتا ہے جب وہ نہانے کے لئے تالاب میں داخل ہوتی ہیں۔ اُس مقام پر امین کے قلم نے شوخی اور بےچارگی دیدنی کے جو مرقع کھینچے ہیں اُن کی جتنی بھی تعریف نہ کی جائے کم ہے۔

ذیل میں اس مقام سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

لگیاں ڈھونڈنے باغ بھیتر تمام — ہر یک ٹھار گذریاں وہ ہر ایک مقام

۱؎ اُردو شہ پارے ص ۲۰

وہاں ڈھونڈیا(ل) بھوت بیزار ہو ۔۔۔ الیس ہیں وہ سب آپ لاچار ہو
کھڑیاں ہو اس ٹھار کیتا آواز ۔۔۔ کرا ے ذرو جھنڈی وحیلہ دراز
توں ہے آدمی یا فرشتہ مگر ۔۔۔ کہ ہے جن پری دیو بیدار گر
تو ہوئے الیس کی سکھے امراد ۔۔۔ قسم ہے خدا کی کریں اس کوں یا شاد
جو کیڑے ہمارے دکھیں ہیں چھپا ۔۔۔ جو کچھ دل میں تھا ہو وے سو دیو تم
انوں ساتھ تب شہ او کھا بول کر ۔۔۔ چھپے راز دل کے سبھی کھول کر
تمارے جو ہے ساتھ بانو حسن ۔۔۔ انے دل میں میرے کیا ہے وطن
مراجیو اس پر ہوا ہے فدا ۔۔۔ خدا اس سیں مجکوں نہ راکھے جدا[1]

شوقی

شوقی کو عادل شاہی شعرا میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی خاندان سے وابستگی میں گذرا، ورنہ وہ قطب شاہی اور نظام شاہی درباروں سے بھی وابستہ رہا تھا۔ اس کی تاریخ وفات کے متعلق اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ ۱۰۶۶ھ سے پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اپنے دور کا نہایت اچھا شاعر تھا۔ اس کی تصنیفات میں دو مثنویاں اور کچھ غزلیں محفوظ ہیں۔ ایک مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" جس میں سلاطین دکن اور وجیا نگر کے ہندو راجہ رام راج کے درمیان ہونے والی جنگوں کا حال نظم کیا گیا ہے اور دوسری مثنوی "میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" جس میں عادل شاہ کی شادی کا حال بیان کیا گیا ہے جو اُس کے وزیر مصطفیٰ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ شوقی کی نظموں سے اُس کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے ذیل میں اُس کی مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" میں سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

---

[1] اردو شہ پارے جلد اول ص ۲۱۳-۲۱۲

ڈوبے تاپ زمین ہو غرقاب میں — گئی جوں زنگی کرے خواب میں
حبش نے پھوال چتر سر پر لیا — ترک دیکھ پر نار سر تل کیا
حبش نے جو پرگٹ ہوا چندر روپ — حبش نے جتنے ترک چینی سر چھپ
بیٹھا ناگ کالا اوڈیا راج ہنس — اوٹھی سیام سندر ہوتا تاج اوس
پڑیا پھول پر جب بھنور نمکہ سیاہ — چھپا ترک زنگی گھر آشکار سیاہ[1]

صنعتی عادل شاہی عہد حکومت کے چوٹی کے شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا نام ابراہیم تھا اور صنعتی تخلص۔ ابراہیم عادل شاہ اور سلطان محمد عادل دو بادشاہوں کا عہد حکومت دیکھا تھا۔ بہت عالم و فاضل اور نازک خیال شاعر تھا۔ ایک مثنوی قصۂ حضرت تمیم کا مصنف تھا۔ اس کے کلام میں خوبصورت تشبیہوں اور فنکارانہ مصوری کے بہت اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ذیل میں اس کی مثنوی میں سے چند شعر انتخاب کر کے درج کئے جاتے ہیں۔

سبک سیر تھا اس گراں بار سات — چلے جاں کہے مرغیکی موں میں بات
کہے دیگ کشتی کوں توں ہمسر — کہ یک ٹھہر چلتا ہے پانی اوپر
اوک جلد تھا اگرچہ بے پائے تھا — سو بے پائے نت آپ پہائے تھا
اگر بیگ جانے کا ہم آپڑے — وہم سات کشتی او کشتی کرے
کرے پاؤں یوں پیٹ میں ییکو دھاؤں — کہ جوں پیٹ میں سانپنی نیکو پاؤں
سورج کی وہیں تاب سوں موج توں — اوپر یوں گرٹ صاف چندنی میں جوں[2]

خوشنود عادل شاہی عہد کا یہ شاعر معمولی حیثیت سے ترقی کرتا ہوا بلند مرتبہ تک پہونچا۔ یہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا غلام تھا۔ اور جب سلطان بیجاپور

[1] رسالہ اردو جولائی سنہ ۱۹۲۹ء [2] اردو شہ پارے جلد اول ص ۲۱۵

کے ساتھ اُس کی بیٹی کی شادی ہوئی تو یہ بھی اُس کے ہمراہ آیا۔ شہزادی اس کے حسنِ انتظام سے بہت خوش ہوئی اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس نے اتنی ترقی کی کہ سلطنت بیجاپور کی طرف سے قطب شاہی دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ جہاں اس کو غیر معمولی اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ چونکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی خدیجہ سلطان بہت علم نواز اور ادب پرور تھی۔ اس لئے خوشنود کو بھی علم و ادب سے شوق پیدا ہونے لگا۔ شاعری کا ملکہ اس کی فطرت میں پہلے سے موجود تھا ملکہ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نے اسے اور بھی ابھارا۔

خوشنود سے دو مثنویاں "ہشت بہشت" اور "یوسف زلیخا" منسوب کی جاتی ہیں "یوسف زلیخا" اب ناپید ہے۔ "ہشت بہشت" دراصل امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔ با عتبار ترجمہ یہ مثنوی بلند پایہ ہے۔ مگر اُس عہد کی دوسری مثنویوں کے مقابلہ میں اس میں سادگی اور سلاست کم ہے۔ یہ مثنوی جواب موجود ہے ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے ذیل میں اس کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اتھا یک بادشاہ سنسار میانے ... سورج کے پھول جوں گلزار میانے
کیا تھا عدل سوں جہاں کوں ... کہ جوں روشن کیا ہو آسماں کوں
اتھا و خوش خرام ہوا یک فرجام ... اچھا نانو اس کا شاہ بہرام
کرے مجلس شراب ارغوانی ... ہمیشہ نت دن کرے زرفشانی
فلاطون بوعلی سے تھے حکیماں ... حضور شاعر کتی نادر ندیماں[۵]

رُستمی ان کے نام کمال خاں تھا۔ رُستمی تخلص کرتے تھے۔ خاندانی پیشہ خوشنویسی تھا۔ محمد عادل شاہ کا زمانہ پایا تھا۔ اور اسی سلطان کی ملکہ خدیجہ سلطان

---

[۵] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۲۲۹

کے حکم سے ۱۰۵۹ھ میں اپنی مشہور مثنوی "خاورنامہ" تصنیف کی تھی۔ مگر یہ مثنوی طبع زاد نہیں ہے بلکہ ابنِ حسام کی فارسی مثنوی "خاورنامہ" کا ترجمہ ہے۔ اور بہت کامیاب ترجمہ ہے۔ چوبیس ہزار اشعار کی طویل نظم کا ایسی خوبصورتی سے ترجمہ کر دینا رستمی کے قادر الکلام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بیشتر اشعار ایسے ہیں کہ نظم پر نثر کا گمان ہوتا ہے۔ واقعات اور مناظر کی تصویر کشی کرنے میں بڑی کمال رکھتا تھا۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

فلک کوں وفاداری اندیشہ نین	بغیر از جفا اس کو کچھ پیشہ نین
اتھی خوب یو زندگی ہور ہوس	اگر مرگ کا ڈر نہ ہوتا اپس
اجل سات کوئی جیو چھپایا نہیں	اپس درد کوں دارو کھایا نہیں
جو ہستی کے کوچے رکھیا ہے قدم	باہر جاونا ہے زراہِ عدم
جو خورشید ہے تو بھی پاگا زوال	جو رستم ہے تو بھی اسے مکرِ زال
بچھانا بھی کوئی یاں بچھایا نہیں	جو اس پر اجل ہت بچھایا نہیں[1]

دولت اس کا نام مرزا دولت شاہ تھا۔ دولتؔ تخلص کرتا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ اس نے عادل شاہ کا عہدِ حکومت دیکھا تھا۔ اپنے زمانہ میں بہت اونچے درجے کا شاعر تھا۔ اس کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان کا باکمال شاعر تھا۔ علم و فضل اور اپنی خوش خلقی کے لئے بہت مشہور تھا۔ امینؔ کی مثنوی "بہرام و حسن بانو" کو اسی نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا تھا۔ ذیل میں اس کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

دیا شاہ نے دیو کوں تب یہ جواب	کہ آؤ اپن مل کے پیویں شراب

---

[1] اردو شہ پارے جلد اول ص ۲۲۱

گیا شہ کے نزدیک تسلیم کر ‏ ‏ اٹھایا شہنشاہ نے تعظیم کر
دونوں مل کے بیٹھے ہوئے ہم کلام ‏ ‏ گئی شاہ کے دل کی دہشت تمام
گیا شاہ اور دیو پین سے گشی ‏ ‏ ہوئے آپ میں آپ دونو خوشی

نصرتی یہ نہ صرف عہد عادل شاہی کا بلکہ جنوبی ہند کا عظیم المرتبت شاعر تھا۔ اس کا نام محمد نصرت اور تخلص نصرتی تھا۔ مشہور مستشرق گارساں وتاسی نے اسے برہمن قرار دیا ہے۔ مگر موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی مستند دلیل پیش نہیں کی اس لئے ہم ان کے خیال کی تائید کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ اس کے مسلمان ہونے کی بہت سی دلیلیں موجود ہیں خود اُس نے اپنے خاندان اور آباؤ اجداد کے متعلق اپنی نظموں میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔ جن کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اسلام اور عربی و فارسی کے متعلق اس کی مستند معلومات اور حضرت خواجہ بندہ نواز سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار، غرض یہ اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ اُس کی مثنوی کے جن حصوں میں اسلامی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اس کا مسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں ہوئی تھی کیونکہ نصرتی کے باپ کا دربارِ شاہی میں بہت اثر و رسوخ تھا اور اسے بہت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ اس کا ہم جولی تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اُس نے نصرتی کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ نصرتی جنوبی ہند کے شعراء میں بہت بلند مرتبت شاعر تھا جس کی تعریف میں بڑے بڑے مورخ اور تذکرہ نویس

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۲۲۱

رطب اللسان ہیں۔ اُس کے عربی و فارسی کے تبحرِ علمی اور مذہبی مسائل پر وسیع معلومات کا سب نے ہی اعتراف کیا ہے۔ اُس کی شاعری کے سرمایہ میں ہمیں قصیدے، مثنویاں اور قطعے ملتے ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ اُس نے کچھ غزلیں بھی لکھی تھیں۔ "گلشنِ عشق"، "علی نامہ" اور اُس کے نو (۱) قصائد کا مجموعہ نصرتی کی شاعری کے قابلِ قدر شاہکار ہیں۔ نصرتی کی زبان بہت سادہ اور بامحاورہ اسلوب بہت دلکش، خیالات بہت نازک اور رزم و بزم کا بیان بہت واقعاتی اور مصورانہ ہے۔ اُس کے قصائد اور کلام علوئے خیال اور حسنِ مضمون کی بہت خوبصورت مثالیں ہیں۔ ذیل میں اس کے ایک قصیدہ کے چند شعر بطورِ نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں میدانِ جنگ کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

کھڑکاں کئی اس سوں دہر سوراں کو لوا ان جیو لگ	زہرا کا زہرہ گل رہیا آواز سن جھلکار کا
کھڑکاں کھڑکاں لگ وک چوندہر سریوں تے چنگیاں اُڑ گیا	جیوں آگ کیاں بجلیاں چمک ہر سیا بدل انگار کا
گرز اں سوں پھر بھجاں یوں کہتی اگنتہ دس	گو بیمن کر جوں نکتے پھر پھٹتا ہے حقا نار کا
لاگی تبر کے ضرب تاں رہی تھی ہٹ کی تیج ہو	بہر رگ کے گل تے تھا عیاں فوارہ لہو کے دہار کا

شاہ ملک یہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مثنوی "شریعت نامہ" کے مصنف تھے۔ شریعت نامہ خالص مذہبی مثنوی ہے جس میں کوئی ادبی و شعری خوبی نہیں ہے۔ مگر اُس دور کے مذہبی لوگوں میں بہت مقبول تھی اور لوگ اسے زبانی یاد کرتے تھے۔ ذیل میں اُس کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں

---

(۱) نصرتی ملک الشعرا بیجاپور کے حالات اور کلام پر تبصرہ مؤلفہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ (انجمن ترقی اردو)

نماز ٹوٹنے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نماز کے تٹنے کے ہیں بیست وپنج ... نمازی نے کرنا ہے یو یاد گنج
نماز میں کرے بات یا کھائے توں ... پھر اوے چو قبلے تے سینا دھوں
بھی کرنا سلام یا توں اُس جواب ... دئے تو بی ٹٹنا ہے سن اے شہاب

شاہ اعلیٰ

ان کا نام شاہ امین الدین اور اعلیٰ تخلص تھا۔ مشہور بزرگ شاعر شاہ برہان الدین جانم کے صاحبزادے تھے۔ خود بھی بہت بڑے بزرگ اور صاحبِ کشوف و کرامات تھے۔ نثر و نظم دونوں میں مہارت تھی۔ دو قصیدوں، ایک عشقیہ نظم، کئی مثنویوں، کچھ غزلوں اور دوہروں کے مصنّف تھے۔ نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ شاہ صاحب کی نظموں میں "محب نامہ" یا محبت نامہ" "رموز السالکین" اور "نظمِ وجود" قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ صاحب کی شاعری مذہبی شاعری ہونے کے باوجود باعتبارِ اسلوب کسی قدر دلکش اور اس صنف میں قابلِ قدر ہے۔ اُن کی طرزِ ادا میں کافی روانی پائی جاتی ہے۔ ذیل میں اُن کے کلام میں سے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

دیکھو شاہ بہروپ صورت جمال
نرمل روپ معشوق ذاتِ کمال
مصلوں خود فراموش لذتوں وصال

پچھوں جگو نہ لے شبہ نمود کہنے نہ آدے بیاں
لامثال خمل نہ نشاں دیکھو نور نشاں
ذاتِ وحدت گنج لامکاں پر گھٹ سب نہاں ہاں

ہاشمی

سید میراں نام، ہاشمی تخلص تھا۔ بیجاپور کے ایک بزرگ سید شاہ ہاشم کے

مرید ہونے کی وجہ سے ہاشمی تخلص اختیار کرلیا تھا۔ علی عادل شاہ کے درباری شاعر تھے۔ بصارت سے پیدائشی طور پر محروم تھے۔ ۱۶۹۶ء میں وفات پاگئے۔ انکی تصانیف میں ترجمہ "احسن القصص"، "یوسف زلیخا"، دیوانِ غزلیات اور کچھ مرثیے شامل ہیں۔ ہاشمی کو جذبات نگاری کے اعتبار سے بلند مقام حاصل ہے۔ انھیں ریختی کا بھی موجد خیال کیا جاتا ہے۔ ذیل میں اُن کی ریختی کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

سجن آویں تو پردے کی نکل کر بھار بیٹھوں گی ۔۔۔ بہانہ کرکے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
دنوں پیاں اُٹھ کہیں گا تو کہوں گی کام کرتی ہوں ۔۔۔ اٹھلتی ہور ٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی

قادر: یہ بھی بزرگ شعراء کے سلسلے میں شامل ہیں۔ عبدالقادر نام اور قادر تخلص کرتے تھے۔ سکندر عادل شاہ کا زمانہ پایا تھا۔ غزل میں تصوف اور اخلاق کے مضامین نظم کرتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

نکو کس پر زبردستی نکو کس کا دل دکھانا ہے ۔۔۔ نبی کیا مال ہو ستی خدا کوں موں دکھانا ہے
نکو کے جو سند پر غروری کا جو تکیہ دھر ۔۔۔ رہا کیا نیند غفلت کر تجھے دنیا تھے جانا ہے
نکو مردم آزاری تجھے مرنا ہے سوں سالے ۔۔۔ عذاباں قبر کے بھاری تجھے بھی ہاں سمانا ہے

عزت و معظم: یہ دونوں شاعر بھی سکندر عادل شاہ کے عہدِ حکومت سے تعلق رکھتے تھے۔ معظم قادر کے شاگرد تھے اور دو مثنویوں "شجرۃ الاتقیا" اور "گنجِ مخفی" کے مصنف تھے۔ ذیل میں ان دونوں کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

ذات احد کی پاک ہے اسے کوئی دیکھ پچھانے
پیو سوں کوں دیکھ کر ہوئے نیو کے دیوانے
جلی ظاہر فسلی دلی ہیں رہ جی سوں کر دنچھانا
مری سوں سنگ پائے کر خفی میں اپسے چھپانا
(عزت)

یو مکتوب معظم ہتے — دیکھ عارف جبکہ کرد ھکے
خود قا دربار کیا ہے — مجھ روایت آپ دیا ہے
میں عاجز اور میں مظلوم — او صاحب حیُ القیوم

(معظم)

بعض اور شعراء عہد عادل شاہی میں کچھ اور شعراء کے نام بھی ملتے ہیں۔ آتشی، ایاغی، سیوا اور شغلی مگر چونکہ ان کا کلام اور حالات زندگی ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے نام ہی لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے۔

عہدِ عادل شاہی کے نثر نگار

عادل شاہی عہد میں نظم کے مقابلے میں نثر کی طرف کم توجہ دی گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ خود عادل شاہی سلاطین شعر کے دلدادہ اور بعض خود شاعر تھے۔ ان کا ذوق و شوق اور قدر دانی دیکھ کر لوگوں نے بھی شعر و شاعری سے رغبت اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند صوفی اور خدا رسیدہ بزرگوں کے سوا عام طور پر کسی نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا۔ ان بزرگوں نے ایک خاص مقصد کے تحت نثر کی کتابیں تصنیف کیں یعنی اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت یہی وجہ ہے کہ اس دور کی نثر کا بیشتر حصہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ذیل میں اس دور کے نثر نگاروں کے حالات زندگی اور اُن کی نثر کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

شاہ برہان الدین جانم یہ وہی بزرگ ہیں جن کا شعراء کے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نثر نگار بھی تھے۔ "معرفت القلوب" اور "ہشت مسائل" آپ کے دو مشہور رسالے ہیں جن میں تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

"جان اے سالک پچھانت کرنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا ہور معرفت کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالماں کوں ہور عاشقاں کوں نہ ہو دو اصلاں کوں ہتو سب گوں تسلی دکھلاتا ہے ہور دل کوں ان پر کر راحت پاتے ہیں۔"[1]

---

[1] "معرفت القلوب" بحوالہ دکن میں اردو ص ۱۲۷-۱۲۶

امین الدین اعلیٰ

ان کا ذکر بھی شعراء کے باب میں ہو چکا ہے۔ یہ بھی جنوبی ہند کے صوفیاء اور بزرگانِ دین میں سے تھے۔ نثر میں تصوف پر کئی رسالے لکھے ہیں۔ "گفتار شاہ امین الدین" اور "گنج مخفی" آپ کے دو رسالے ہیں۔ ذیل میں ان کی نثر کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنے چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے امین دیکھ ہوا۔ اس سے شاہد کہتے ہیں۔ یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے اپس کوں دیکھا۔ اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں[1]"۔

عادل شاہی نظم و نثر پر تبصرہ

اسے اُردو زبان و ادب کی خوش بختی ہی سمجھنا چاہیے کہ اس کے ابتدائی دور ہی میں اسے کچھ ایسے سرپرست مل گئے جنھوں نے اسے متاعِ عزیز سمجھ کر کلیجے سے لگایا۔ اس کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے امکان سے بڑھ کر جد و جہد کی۔ قطب شاہی عہد کی طرح عہدِ عادل شاہی میں بھی سلاطینِ دکن اُردو کے سرپرستوں میں پیش پیش رہے۔ خود بھی شعر و شاعری سے شغف رکھتے اور شاعری سے شغف رکھنے والوں کی سرپرستی و حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ روز بروز شعراء و ادباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کثیر التعداد شعراء نے اپنے طور پر زبان و بیان کو سنوارنے اور اظہارِ خیال کے جدید اسالیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عادل شاہی عہدِ حکومت میں شاہی، شوقی، صنعتی، رستمی اور نصرتی جیسے

---

[1] رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۸ء

باکمال اور یگانۂ روزگار شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے غزل قصیدہ، مثنوی اور بعض دیگر اصنافِ سخن میں اپنے کمال کے نمونے دکھلائے۔ تشبیہات و استعارات اور رزم و بزم کے واقعات کی تصویر کشی کرنے میں یہ دور گذشتہ تمام ادوار سے سبقت لے گیا۔ اخلاقی اور مذہبی نظمیں باوجودیکہ خشک اور اکتا دینے والی ہوتی ہیں مگر اس دور میں مذہبی اور اخلاقی شاعری کو بھی الیسا طرز ادا دیا گیا کہ یہ خشک شاعری بھی قدرے شگفتہ نظر آنے لگی۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی مثال ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہے۔

نثر نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ جو چند رسالے ہمیں ملتے ہیں وہ خالص مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے قطب شاہی دور عادل شاہی دور سے بہتر تھا کہ اس میں نثر کی مذہبی کتابوں کو بھی قدرے دلچسپ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ وجہی کی سب رس اس دعوے کا مکمل اور واضح ثبوت ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ عادل شاہی عہد کی نثر زبان اور محاورے کے اعتبار سے قطب شاہی نثر سے کسی قدر آگے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس عہد کی نثر دلنشینی کے اعتبار سے پیچھے ہے صرف امین الدین اعلیٰ کی نثر میں کسی قدر دلکشی ضرور ہے

میسور میں اُردو

اجمالی تاریخ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں ہم نے اُردو کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ سلطان علاءالدین خلجی کے حملے سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد و رفت برائے نام تھی اور خاص طور سے شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے تو جنوبی ہند کا خطہ بالکل ہی اجنبی دیس تھا جب سلطان علاءالدین خلجی نے سنہ ۱۳۱۰ء میں جنوبی ہند کی طرف پیش قدمی کی تو اُس نے میسور کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔ اُس کے بعد سلطان محمد تغلق نے بھی سنہ ۱۳۲۱ء میں علاقۂ میسور کی تسخیر کی۔ ان دو مسلمان بادشاہوں کی فتوحات کی وجہ سے شمالی ہند کے لوگ جنوبی ہند آنے جانے لگے۔ اور اُن کے بہت سے خاندان تو مستقل طور پر وہیں آباد ہو گئے۔ مگر حالات نے پلٹا کھایا اور یہ حصہ پھر مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا۔

سنہ ۱۶۳۶ء اور سنہ ۱۶۴۷ء کے درمیان بیجاپور کی مسلمان فوجوں نے متعدد بار میسور پر یلغاریں کیں اور آخر کار اس پر قبضہ کر کے ہی دم لیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بیجاپور اور اس کے علاوہ بعض اور اُردو بولنے والے علاقوں کے لوگ میسور میں آنے جانے لگے اور بہت سے مستقل طور پر وہیں آباد ہو گئے۔

سنہ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے جنوبی ہند کی منتشر سلطنتوں کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کرنے اور اسلامی سلطنت کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ مضبوط و مستحکم کرنے کے خیال سے جنوبی ہند پر حملہ کیا تو میسور بھی براہِ راست

مغلیہ سلطنت کے تسلط میں آگیا۔ اس طرح شمالی ہند اور جنوبی ہند کے درمیان جو بہت بڑی دیوار حائل تھی وہ گر گئی اور شمالی ہند کے اردو بولنے والے لوگ بلا روک ٹوک جنوبی ہند میں آنے جانے لگے اور جنوبی ہند کے لوگ ان کی زبان اور تہذیب و تمدن دونوں سے متاثر ہونے لگے۔

اس کے بعد وہ دور آیا جب ہندوستان کے بدقسمت مسلمان باہمی منافرت، نفاق، خودغرضی اور آرام طلبی کا شکار ہو کر اپنی سطوت و شوکت ضائع کرنے لگے۔ وسیع و عریض سلطنت طوائف الملوکی کا شکار ہو کر مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس وقت میسور کی سرزمین سے ایک اولوالعزم اور غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والی شخصیت اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے میسور کے تخت سلطنت پر قابض ہو گئی۔ نواب حیدر علی خاں کے سریر آرائے سلطنت میسور ہونے کے بعد میسور میں اردو کا ستارہ بھی چمک اٹھا اور اہل میسور اردو زبان .... میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لینے لگے۔

یہ ہے میسور میں اردو کی ابتدا کا اجمالی خاکہ ——— اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سرزمین میں آج سے چھ سو سال پہلے اردو کی تخم ریزی ہو گئی تھی۔ البتہ ابتدا میں... اتنا ہی کمزور تھا جتنا جنوبی ہند کے دوسرے علاقوں اردو کا پودا۔ مگر اس میں نشو و نما پانے اور پروان چڑھنے کے آثار ضرور تھے۔

ابتدائی دور کا نمونہ نثر و نظم

سلطان حیدر علی کے میسور پر قبضہ کرنے سے پہلے میسور میں اردو کا کیا رنگ تھا۔ اس کا اندازہ ایک گمنام مصنف کی کتاب ترجمہ "تنبیہ الغافلین" کی عبارت سے لگتا ہے۔ جو "میسور میں اردو" کے مصنف محمد سعید عبدالخالق کے خیال کے مطابق ۹۹۶ھ میں ترجمہ کی گئی تھی۔

"میں ایمان لیا یا خدای تعالیٰ پر خدای تعالیٰ ایسا ہی تمام عالم کو پیدا

کیا ہے۔ اپنے جیو سوں کسی کی سکا فنی سوں نہیں ہوا جملہ عالم کوں رزق دینہار ہوا ایمان سوں ایمانی کوں مارینہار سولو دھی تمام عالم کو پیدا کرینہار!!

اس ابتدائی دور کی نثر کا نمونہ آپ نے دیکھا۔ اب ذیل میں محمد علی ابن مخدوم صدیقی کی منظوم کتاب ہزار مسائل کے خاتمہ کے چند شعر بھی دیکھئے یہ کتاب بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اور ۱۱۰۵ھ کی تصنیف ہے۔

ہزار ایک سو پر تھی پنجاہ شمار ہی ہجرتکی تھی سالہ سنہ یو قرار
محمد علی ابن مخدوم نام کیا اس رسالہ کو خوش انصرام

اُردو حیدر علیؒ کے دور میں

نواب حیدر علی کے برسر اقتدار آنے کے بعد میسور میں اسلامی علوم اور اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں میسور نے بڑے بڑے اہل کمال پیدا کئے جنھوں نے نظم و نثر میں بعض نادر اور بیش بہا تصانیف پیش کیں۔ ان میں سے شاہ محمد صدرالدین، عاصی، خادم، فقیر، شہباز، میر حسین علی، محمود خاں شیرانی، شاگرد کمال کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت صوفیا اور فقرا کی تھی، جنھوں نے خالص مذہبی اخلاقی اور تصوف کے مسائل بیان کئے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک شعر بطور نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بیدھر ڈھلاوے دل تری جوں چال نی چالا ہیں ہیں چال اپنی چھوڑ کے چلتی ہوں شہ کی چال میں

(شاہ محمد صدرالدین)

جبکہ خوف ہر وہ نہیں اُسکی ہجرت عار ہے زندگی میں پاس عزت مرد کوں درکار ہے

(عاصی)

دن رات یاں حشر ہے جو دود ہے قمر کا سارے جہاں کہتے ہیں اک روز ہے حشر کا

(خادم)

یارب تو اپنا فضل کر ان چار حرفاں پر سدا
فا۔ق۔ی۔ر۔یہ سوتوں آسان کر روزِ حشر
(فقیر)

کرسیاں ہوئی ہیں یوں تمام
نواب حیدر کے عمل
(محمود خاں تیرانی)

ہم اگر چاہیں تو اوپر اُڑ کر جائیں
جو ہے دل میں کاڑ پردہ آڑ کا
(شاکر)

کی آفتاب آتشیں نے کے غم کے سوزاں ہے ہنوز
ماہ اس تپش کے لوتی ہیں گذاراں ہے ہنوز
(کمال)

اُردو سلطان ٹیپو رح کے دور میں

حیدر علیؒ کی وفات کے بعد سلطان ٹیپو سریر آرائے مسند ہوا۔ سلطان موصوف صاحبِ سیف ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ قلم بھی تھا۔ عربی، فارسی اور دکنی کا فاضل اور شاعر تھا۔ علم و ادب کا سرپرست اور دلدادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا عہد زریں جہاں مسلمانوں کے لئے قوت و شوکت کا پیغام لے کر آیا تھا وہاں اُردو زبان کے حق میں بھی آبِ حیات کا حکم رکھتا تھا۔ سلطان کی علم دوستی اور اُردو سے شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے دور میں اُردو نظم و نثر کا قابلِ قدر سرمایہ تخلیق ہوا۔ ان تخلیق کاروں میں مندرجہ ذیل لوگوں کے نام ملتے ہیں۔

حسینؔ، زین العابدین، حسن علی عزتؔ، طربؔ، محمد اسحاق، خانہ زاد، زٹلؔ اور کرمانی۔ ذیل میں ان میں سے ہر شاعر کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

صفت کہنے سکت نہیں ہر زبان میں
نہیں آتا قلم کے بھی دہانیں
(حسینؔ)

ملک ہندوستان میں دین کا وہی سلطان ہو
غرق جس کے آب خنجر میں فرنگستان ہے
(زین العابدین)

گلرخاں کرتا ہوں سلطان کا اب تم سوں بیان — ہم عجب کچھ طرز اس کا طرفہ ہے داستان
(حسن علی عزت)

عجائب سنو دوستان داستان — کہ جس کے بیان میں ہے قاصر زبان
(ظریف)

فارسی سے تھی نثر یہ آشکار — تھے چھپے یہ بے بہا لعل و گہر
(محمد اسحاق)

شام تو ہو گئی سحر ہو جائے گی — روشنی ذرہ بحر و بر ہو جائے گی
(خانہ زاد)

اے سراج بزم دولت از نور روشن ہو سرا — کیا سبب تاریک ہے اب تک میرا جھونپڑا
(زنجل)

اے فلک بس تو سفلہ پرور ہے — نیک و بد خود و کینہ پرور ہے
(کرمانی)

اُردو سلطان ٹیپو کے بعد

انگریز عرصے سے سلطنتِ خداداد میسور کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کا غیر معمولی عزم، حوصلہ اور تدبر اُن کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈال رہا تھا۔ انھوں نے کئی بار ہندوستان کی بہت سی طاقتوں کو ساتھ لے کر میسور پر چڑھائی کی۔ مگر میسور کے دونوں فرماں رواؤں حیدر علی اور ٹیپو نے انھیں دنداں شکن جواب دے کر میدان سے مار بھگایا۔ آخر کار سامراجیوں کی عیارانہ چالیں کامیاب ہو گئیں۔ سلطان ٹیپو کو اپنوں ہی نے دغا دی۔ ملک میں سازشوں کا جال بچھا دیا گیا۔ فوج کے بڑے بڑے سردار انگریزوں سے مل گئے اور سلطان ٹیپو سرنگا پٹم کے قلعہ کی حفاظت

کرتا ہوا اپنے لہو سے ہندوستان کی تاریخ آزادی کا خونیں باب لکھ گیا۔

سلطان کی شہادت کے بعد ۱۷۹۹ء میں میسور کی ریاست ہندو راجہ کے سپرد کردی گئی۔ مگر حیدر علی اور ٹیپو کے زمانے میں اُردو کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی تھیں کہ اب اسے بڑے سے بڑا طوفان بھی نقصان نہیں پہونچا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ درخت بڑھا، پھلا پھولا۔ اور پھل پھول لا کر رہا۔ اس دور میں میسور کی سرزمین سے بڑے بڑے باکمال شاعر اور نثر نگار اُٹھے اور اپنی تخلیقات سے اُردو کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کر گئے۔ حیاتؔ، لطیفؔ، شاہ عبدالحی، عابدؔ، نسیمؔ، غمؔ، اظہرؔ، تحقیقؔ، آرامؔ، دلؔ، جادوؔ، کلیمؔ، مقبلؔ، شہابؔ، الکمیؔ، آثمؔ، احمدؔ، شوکتؔ، صابرؔ، طالبؔ، عبدیقؔ، ولیؔ، ناظمؔ، محمودؔ، میکشؔ، ارمانؔ، مغفورؔ، امیرؔ، راجیؔ، اور جوہرؔ اس دور کے لوگ ہیں جو ۱۷۹۹ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ ذیل میں ان میں سے بعض شعراء کا نمونہ کلام درج کیا جاتا ہے تاکہ اس دور کے تدریجی ارتقا کا پتہ چل سکے۔

گرجاں میں نام اللہ ورد جان کا — کہ وہ معبود ہے دونوں جہاں کا (حیاتؔ)

چشم صبا چمن میں نرگس کو دیکھ کر — نادم ہوا عجب طرح سے میں اپنے ندیم کا (لطیفؔ)

اشک چشموں پہ مری حکم قمر رکھتا ہے — یہ وہ ہے آب کہ آتش کا اثر رکھتا ہے (عابدؔ)

نزع میں یاد مجھے کس کی ادا آتی ہے — جام کوثر لئے ہاتھوں میں قضا آتی ہے (نسیمؔ)

آرام سے کیا سوتی ہیں آغوش لحد میں — جو گود کے پالے تھے پڑے گور کے پالے (دلؔ)

اے گل گلے سے تو نہ لگائے مجھے اگر — بو ہو کے چھپ رہوں ترے پھولوں کے ہار میں (کلیمؔ)

تہ و بالا نشیمن کا کیا ہیں خانہ خراب — ہے اب تو ہاتھ مرا میرا آشیاں صیاد (شہابؔ)

شوق نظارہ میں کل تماشی ہمہ تن شوخی — آج پابند حیا ہوتے ہو انصاف کرو (ولیؔ)

سازِ ہستی چھیڑ اے مسلم تو پھر مضراب سے — کام لے برق تپیدہ کا دل بیتاب سے (جوہرؔ)

تبصرہ میسور میں اُردو کا چھے سو سالہ خاکہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کی ابتدا کو دیکھ کر ہی یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جنوبی ہند کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں اس سرزمین پر بولی اور لکھی جانے والی اُردو نسبتاً صاف اور شیریں تھی۔ چنانچہ یہ بات بلا کسی مبالغہ اور جھجک کے کہی جا سکتی ہے کہ علاقہ میسور میں تصنیف ہونے والی سب سے پہلی کتاب ترجمہ "تنبیہ الغافلین" کا اسلوب تقریباً اس عہد کی قطب شاہی نثر کی کتاب "احکام الصلوٰۃ" کے مقابلہ میں زیادہ ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ البتہ ایک بات ضرور افسوسناک ہے اور وہ یہ کہ میسور میں نثر کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ پرانے دور کے سرمایہ میں ایک دو کتابوں کے سوا ہمیں نثر پر کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں ملتی ہے۔ البتہ نظم کا باب بہت روشن اور تابناک ہے اور ہر دور میں اعلیٰ شاعری کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر یہ سرزمین بجا طور پر فخر کر سکتی ہے تخیل کے ساتھ ساتھ زبان و محاورہ کے اعتبار سے بھی میسور کی شاعری نہ صرف تمام جنوبی ہند کی شاعری سے آگے نظر آتی ہے بلکہ شمالی ہند کے لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سلطان ٹیپو کے عہدِ حکومت ہی میں ایسے شعرا منظرِ عام پر آ گئے تھے جن کی زبان لکھنؤ اور دلی کے شاعروں سے کسی طرح کم حیثیت نہیں تھی ؎

؎ اس باب کی تصنیف میں سالنامہ اُردو لٹریری سوسائٹی، مجلہ عثمانیہ، "مدراس میں اُردو" اور "میسور میں اُردو" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

مدراس میں اُردو

اجمالی تاریخ مدراس میں مسلمانوں کا عمل دخل اُس وقت سے ہے جب وہ ہندوستان کے حاکم بھی نہیں تھے۔ اُن کے تجارتی جہاز مدراس کے ساحلوں سے گذرتے ہوئے یہاں لنگر انداز ہوتے تھے۔ اُن کے اہلِ مدراس کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ اور وہ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے حساب کتاب اور لین دین کے معاملات طے کرتے ہوئے جو گفتگو کرتے تھے ان میں ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہتے تھے۔ اُس کے بعد ۷۱۰ھ میں سلطان علاءالدین خلجی کی فوجوں نے اور پھر ۱۳۶۱ء میں سلطان محمد تغلق کے لشکروں نے جنوبی ہند کی طرف یلغار کی اور مدراس بھی اسلامی سلطنت کا جزو بن گیا اُس کے بعد بہمنی قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے ساتھ بھی ان کی جنگیں رہیں جن میں آخر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اس طرح بکثرت مسلمان خاندان وہاں جاکر آباد ہو گئے جن کی زبان میں شمال ہندوستان کی زبانوں اور عربی و فارسی، ترکی و پشتو وغیرہ کے کافی الفاظ تھے۔ اس سے پہلے اہل مدراس کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات ضرور تھے مگر اُن مسلمانوں کے ساتھ جو عربی زبان بولتے تھے۔ بہاکرت یا اس قسم کی زبانیں بولنے والوں سے اُن کی راہ و رسم نہیں تھیں۔ احاطۂ مدراس میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخلہ کے بعد عربی کے ساتھ ساتھ ترکی، پشتو اور پراکرت زبانیں بھی یہاں پہونچ گئیں۔ مسلمانوں کے وہاں آباد ہو جانے اور مسلسل آمد و رفت سے ایک

نئی زبان معرضِ وجود میں آئی جس میں وہاں کی مقامی زبان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، پشتو، ترکی اور برج بھاشا کے الفاظ بھی شامل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہی زبان اُردو کی شکل اختیار کر گئی اور اس سرزمین پر خوب پھلی پھولی۔ اس زبان کے .... بڑے بڑے اہلِ قلم پیدا ہوئے۔ جن کی تخلیقات آج اُردو کے علم برداروں سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔

مدراس کا پہلا شاعر ذیل میں ارکاٹ (علاقہ مدراس) کے اُس شاعر کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے جو جدید تحقیق کے مطابق مدراس کا سب سے پہلا شاعر تھا۔ اس کا نام عبدالمومن اور مومن تخلص تھا۔ ۱۰۹۳ھ تک زندہ تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب بیجاپور پر سکندر عادل شاہ حکومت کر رہا تھا۔ مومن کی شاعری میں ہمیں ایک مثنوی اسرارِ عشق ملتی ہے یہ ۱۰۹۳ھ میں لکھی گئی۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر اس کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

عجب دی شب کہ منجن سیم کر حل — عروس بدر سر تمنا نور کی جل
منجن خانی تھی مشرق کی نکل بہار — بٹھی آ تخت پر نیسلم کی اظہار
تجلی کا دکھانے جب نبی کوں — چو رچو کی گتیں لالی نکمت سوں[1]

دوسرا دور مدراس میں اُردو کا دوسرا دور جو ۱۱۰۰ھ سے ۱۲۰۰ھ تک پھیلا ہوا ہے پہلے دور کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ اُمید افزا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں مدراس جن صوبیداروں کے زیرِ حکومت رہا وہ بہت علم دوست اور اہلِ کمال کے قدر دان تھے۔ ان میں سے پہلا صوبہ دار سعادت اللہ خاں تھا جو مغلیہ خاندان کے تسلط کے بعد حاکم مدراس ہو کر آیا تھا خود

---

[1] اسرارِ عشق (قلمی) بحوالہ دکن میں اُردو ص ۱۶۹

شاعر تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور کا مدراس اپنے دامن میں اُردو شعر وادب کے بعض گراں بہا شہ پارے رکھتا ہے۔ سعادت اللہ خاں اور اُن کے بعد والاجاہی خاندان کے فرماں روا علم و ادب کے دلدادہ اور سرپرست تھے اسی لئے اس دور میں ہمیں مُنشی، شاہ ابوالحسن قربی، ولی ویلوری، واٰلہ، امجدی، مسرور، غوثی، آگاہ، اعظم اور شاہ محمد جیسے شاعروں اور نثر نگاروں کے نام ملتے ہیں ذیل میں اس دور کی نظم و نثر کے نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے۔

چاند شرماتے کیا گل کو تیرے رنگ اکل
خون ہوا فاقہ کا دل نکہت گیسو کے اکل
(منشی)

ولی ہور وضتہ الشہدا کا مال
نہ یکدم فسکر کر منجلس سوں خال
(ولی ویلوری)

گرم ہے ہنگامہ ہر سو یار کا
ہے تماشا جلوۂ دیدار کا
(امجدی)

شاخِ بلند پر ثمرِ خام تھا مرا
اس پختگی نے خاک میں آخر ملادیا
(مسرور)

مدینے پر او آئے پھر دگر بار
احد کے کوہ کنے اترے بلا عار
(غوثی)

زلف میں مونہہ کو چھپایا نہ کرو
شام کو صبح میں لایا نہ کرو
(آگاہ)

سما دکھا ہے ستارے تو جڑ
کہ گویا ہے نیلم میں موتیوں کا لڑ
(اعظم)

سگل مہتاب کی شاہی کون لشکر
کہا خورشید ساری جگ منور

تیسرا دور

مدراس میں اُردو کا تیسرا دور جو ۱۲۰۰ھ سے ۱۳۰۰ھ تک پھیلا ہوا ہے تاریخ ادب کا اہم ترین دور ہے۔ اس دور میں گذشتہ ادوار کے مقابلے میں اُردو نظم و نثر نے کہیں زیادہ ترقی کی۔ اس دور کے شعراء کی فہرست بہت طویل ہے اور نظم کا سرمایہ بہت وسیع ہے یہ خصوصیت اسی دور کو حاصل ہے کہ اس میں بکثرت امراء و روساء نے بھی شعر و ادب میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ نہ صرف دلچسپی لی بلکہ خود بھی اُردو شاعری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے۔ کوشش کی جائے گی کہ ذیل میں اس دور کے قابلِ ذکر شعراء کے اسماءِ گرامی اور نمونۂ کلام درج کر دیا جائے۔

تیرے ہی واسطے اے رونقِ آبادیٔ دل
آگے ویرانۂ دنیا کو بسایا ہم نے
(ممتاز)

سلسلہ برق کو پہنچے ہے دلِ سوزاں سے
دفترِ داغ کو میں نے جو اُٹھا کر دیکھا
(اعظم)

کرشمہ تھا، غمزہ تھا، اور ناز بھی
ادا بھی تھی اور آن و انداز بھی
(نامی)

ایک دم جلنے پہ مت لاف کرا اے پروانہ
شمع کو دیکھ کہ تا صبح جلی جاتی ہے
(معجز)

روز کرتا ہے قتل نکال کوں
ظلم کا ہات تیرے خنجر ہے
(حاکم)

پلا جلد مشتاق ہوں جام کا
مجھے کام ہے ساقیا کام کا
(نادر)

یار جب ملتا ہے مذنب آن کر
باقی تب رہتا نہیں کچھ اختیار
(مذنب)

غبارِ دنیا سے موجِ دریا ہمیشہ دامن جھٹک رہی ہے
ہمارے حرص و ہوا کی کشتی الٰہی اب تک اٹک رہی ہے

(لطیف)

نثر نگار — نظم کی طرح اس دور میں نثر کی طرف بھی توجہ دی گئی اور مولوی محمد غوثؔ، عبدالصمد، شیخ آدم، شاہ ابوالحسن، مولوی محمد صبغۃ اللہ، اور سید احمد کے نام ملتے ہیں۔ نثر کی یہ کتابیں اسلامیات اور اخلاقیات سے متعلق ہیں بعض کے موضوع اسلامیات سے مختلف بھی ہیں۔ ذیل میں بعض نثر نگاروں کی کتاب کا ایک ایک اقتباس اور اس کے مصنف کا نام درج کیا جاتا ہے۔

"جان تو بیشک بندہ جانچا گیا ہے درمیان اس کے کہ فرماں برداری کرے وہ اللہ برتر کی پس ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ نافرمانی کرے اس کی پھر عذاب کیا جاوے اور جانچ اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل تمرع کے اور غیر تمرع کے"

(مولوی محمد غوث ترجمہ کیدانی)

"یک روز حضرت یعقوب علیہ السلام کی ماں کہی کہ توں یہاں اپنے جان کے خوف میں رہتا ہے۔ رات کے وقت نکلتا ہے توں میرے ساتھ شام کے ملک کو چل وہاں میری بہن کی لڑکی سے تیری شادی کرتی ہوں۔ جب یعقوب علیہ السلام اور انو کی ماں دونوں مل کر چلے تب انو کی ماں یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل رکھے"

(ترجمہ فارسی قصص الانبیاء از عبدالصمد)

"دارالحکومت مدراس الیسٹ انڈیا کمپنی کے علاقے میں ہے سو ہندوستان کے چار حصوں میں کا ایک حصہ ہے اس کو کبھی گزٹ یعنی سرکاری کاغذ

میں دارالحکومت فورٹ سینٹ جارج بھی لکھا کرتے ہیں...... اس ضلع میں جملہ پانچ لاکھ ستر ہزار اسی پر تین آدمی ہیں۔" (مختصر بیان دارالحکومت مدراس" مصنفہ شاہ ابوالحسن)

چوتھا دور مدراس میں اُردو کا چوتھا دور ۱۳۰۰ھ سے لے کر ۱۳۷۵ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں اُردو زبان و ادب سے دلچسپی قدرے کم ہو گئی۔ گذشتہ عہد کے لوگ جنھوں نے بڑے ذوق و شوق سے علم و ادب کی تحصیل کی تھی رخصت ہو چکے تھے۔ جو رہ گئے تھے وہ بھی حیدرآباد وغیرہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ نئے دور کے لوگوں کو شعر و شاعری سے رغبت کم تھی۔ مگر پھر بھی گذشتہ ادوار میں اُردو نظم و نثر نے جو بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ اسے اُس کی جگہ سے گرانا آسان نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب سے غیر دلچسپی ہونے کے باوجود بھی اس دور میں شاعروں اور نثر نگاروں کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ جن میں سے بعض قابلِ ذکر لوگوں کے نام اور نمونۂ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

بے محل اُٹھتا نہیں ہے ایک بھی ترا قدم — کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار
(فاکر)

مجھ بے گنہ کے قتل سے حاصل ہوا نہ کچھ — مقتل سے قاتل آج بہت منفعل گیا
(ریتی)

عاقل کو دھیان رہتا ہے کسبِ کمال کا — نادان ہیں کر رہے ہیں تقاضا جوبال کا
(عباس)

بے مایہ نہ کر یارب سرمایۂ ایماں دے — مجھ بے سروساماں کو فکرِ سروساماں دے
(شاکر)

ساز مطرب میں بھی ہو سوزِ طرب سوزِ نہاں　　بر سرِ نغمہ کوئی رقصِ برآوازِ نہ ہو

(نظمی)

دیوانۂ اُلفت کو دونوں ہی برابر ہیں　　وہ گوشۂ زنداں ہو یا دامنِ صحرا ہو

(روحی)

جس روز سے اک حورِ شمائل سے لگی ہے　　یہ آنکھ مری راتوں میں شکل سے لگی ہے

(برقی)

نثر نگار مدراس میں اُردو کا جو تھا دورِ نثر کے حق میں کچھ زیادہ ناساز گار نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چند نثر نگاروں کی نثر میں ترقی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی نثر کا کارواں رواں دواں نظر آتا ہے۔ ذیل میں اُس دور کی نثر کے نمونے اور اُن کے مصنفوں کے اسم ہائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔

" معلمان قطب نما کے دائرہ کو بتیس حصے کرتے ہیں۔ ہر حصہ کو فن کہتے ہیں آٹھ فن کا ایک مربع دائرہ ہوتا ہے۔ ربع دائرہ کو نو حصے کر کے ہر حصہ کو درجہ کہتے ہیں، ان فنوں کے نقطوں کے مقابل جو ستارہ طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے۔ اس فن کو اس ستارہ کا مطلع یا مغیب کر کے نام رکھتے ہیں " (مولوی محمود)

" ہندوستان جنت نشان کو لوگ ضعیف الاعتقادی اور وہم پرستی کا گھر سمجھتے ہیں، بلسا اوقات ایسے معترضین ان جملہ امور کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن کے وہ خود شکار ہیں۔ مثال کے طور پر لیجئے۔ ایسے کتنے روشن خیال انگریز ہیں جن کے دماغ خرافات عقیدوں اور بے ہودہ وہموں سے خالی ہیں۔ اس کا جواب بہت ممکن ہے آپ کو نفی میں ملے "

(پروفیسر ڈاکٹر قطب الدین)

"اے دلِ مضطر، تڑپ، تڑپ!! زور سے تڑپ!!!۔ ایک دم کے لئے بھی اپنی تڑپ میں کوششِ پیہم کو نہ چھوڑ ــــ یاد رکھ لے تیرا سکون تیری موت کا مترادف ہے۔ تڑپ اور تڑپ! تجھ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ تجھ میں وہ اگلا سا سوز و گداز نہیں رہا ــــ" (رضا کر)

صبح کا سہانا وقت تھا، میں خیابانِ چمن میں تازہ لہلہاتے ہوئے پھولوں کی مہک سے مست بیٹھا تھا۔ دنیائے محبت میں کھویا ہوا ــــ اُس وقت ایک اندھی لڑکی مجھے ایک تحفۂ محبت پیش کرنے آئی ــــ وہ محبت کا تحفہ ــــ ایک پھولوں کا ہار کنول کے پتے میں لپٹا ہوا تھا ــــ میرا دل مسرتوں سے لبریز ہو گیا ــــ اور میں اس کو اپنے گلے میں پہن لیا ــــ لیکن ....." (ارشد حیدری)

اخبارات و رسائل

مدراس کا دامنِ علم و ادب اخبارات و رسائل سے بھی خالی نہیں رہا۔ اس سلسلے میں "عمدۃ الاخبار" کو مدراس کا سب سے پہلا اخبار بتایا جاتا ہے۔ جو مہینے میں تین بار نکلتا تھا۔ اس کے بعد متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ جن میں سے "مراۃ الاخبار" (سنہ ۱۸۴۷ء) "صبح صادق" (سنہ ۱۸۶۰ء) "امیر الاخبار" (سنہ ۱۸۶۸ء) یہ وہ چند نام ہیں جو سنہ ۱۸۰۰ء کے اواخر تک شائع ہونے والے اخبارات میں سے انتخاب کر کے درج کئے گئے ہیں ورنہ اور بھی بہت سے نام ملتے ہیں سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے لے کر اب تک جو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ان میں سے "جریدۂ روزگار" (ہفت روزہ) "نیرِ آصفی" (ہفت روزہ) "مخبرِ دکن" (ہفت روزہ) "آزاد ہند" (روزنامہ) "قومی رپورٹ" (روزنامہ) "مسلمان" (روزنامہ) "رفیق" (ماہنامہ) "مصحف" (ماہنامہ) "جلوۂ سخن" (ماہنامہ)۔ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ بلند پایہ اخبارات و رسائل ہیں جنھوں

نے مدراس کے عوام میں اخبار بینی کا ذوق عام کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا سیاسی علمی اور ادبی شعور بھی بیدار کیا۔

مدراس کی اُردو پر تبصرہ مدراس میں اُردو کی مختصر روداد بیان کر دینے کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ قارئین ایک نظر میں اس سرزمین پر اُردو کی ابتدا نشو ونما اور ارتقا کے متعلق کچھ اندازہ کرلیں۔

مدراس میں اُردو چار مختلف ادوار سے گذری۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے دور تک اس کا عروج نظر آتا ہے مگر چوتھے دور میں آکر وقتی اور عارضی سا جمود محسوس ہوتا ہے۔ بہمنی اور قطب شاہی شعرا کے برعکس مدراس کے شعراء نے زبان اور محاورہ کے ارتقائی مراحل بہت جلد طے کر لئے۔ دوسرے ہی دور کی شاعری دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ زبان کے مزاج شناس اور الفاظ کی پرکھ اور ان کے محل استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی زبان بہت ہموار تھی قصائد اور مرثیہ کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی اور بعض بہت بلند پایہ شہ پارے تخلیق کئے گئے۔ چنانچہ دیوان، آگاہ، سرور اور غمگین کے مرثیہ خاص طور پر جذبات نگاری کے اچھے شاہکار ہیں۔ مگر قصائد کا معیار اونچا نہ ہوسکا۔ تیسرا دور تخیل کی نزاکت لے کر آیا۔ دوسرا اور یہ تیسرا دور مثنویوں کے لئے بہت سازگار تھا۔ اس دور میں بکثرت اور کافی طویل مثنویاں لکھی گئیں جن میں سے بعض کی زبان دلی اور لکھنؤ کے مثنوی نگاروں کی سی معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر باقر آگاہ کی مثنوی "گلزار عشق"! تیسرے دور میں مدراس سے اخبارات و رسائل کا اجراء ہوا، شعراء کی کثیر تعداد پیدا ہوئی۔ ادبی خیالات کو جلا دی جانے لگی۔ جو تدریج چوتھے دور بلکہ اب تک جاری ہے۔

مدراس کی سرزمین اُردو نثر کو بھی خوب راس آئی۔ ہر دور میں قابل ذکر تخلیقات پیش کی گئیں۔ مذہبی علوم کی کتابوں کے علاوہ، جغرافیہ، علم ہئیت اور افسانوی

ادب غرض علم و ادب کے بہت سے شعبے اس کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ نثر کا اسلوب ابتدا ہی سے بہت نسبتاً صاف، سلیس اور تکلف و تصنع سے خالی نظر آتا ہے۔ سادگی نثر کے ہر دور کی خصوصیت رہی ہے۔

عہدِ مغلیہ ــ اور اُردو

مغلِ اعظم اورنگ زیب عالمگیر ایک عرصہ سے تسخیرِ دکن میں کوشاں تھا۔ آخر اُس کی ثابت قدمی اور عالی ہمتی رنگ لائی اور تقریباً دو دو سو سال حکومت کرنے کے بعد ۱۰۹۶ھ میں عادل شاہی اور ۱۰۹۸ھ میں قطب شاہی سلطنتوں کے چراغ گل ہو گئے۔ اس طرح جنوبی ہند بلا واسطہ شمالی ہند سے مل گیا اور ہمالیہ پہاڑ کی ترائی سے لیکر راس کماری تک مغلیہ سلطنت کا علم لہرانے لگا۔

مغلِ اعظم اپنے زہد و تقویٰ اور سخت گیری کی وجہ سے عام طور پر ایک خشک اور کٹر مذہبی بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دکن کے قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کی طرح رنگین مزاج اور شعر و ادب کا دلدادہ نہیں تھا۔ مگر یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ اسے شعر و ادب سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ "رقعاتِ عالمگیری" اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں اور اُن کی ادبی حیثیت اہلِ علم سے آج بھی خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہے۔ پھر اس کی شعرا نوازی کے ثبوت میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ تسخیرِ دکن کے بعد جنوبی ہند کے مشہور شاعر نصرتی کو ملک الشعراء کا خطاب دینے والا اورنگ زیب عالمگیر ہی تھا۔

۱۰۶۲ھ میں جب اُس نے اورنگ آباد کو اپنا مستقرِ حکومت قرار دیا تو علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کی کافی تعداد اورنگ آباد میں جمع ہو گئی۔ اُردو زبان کا مشہور اور باکمال شاعر ولی دکنی بھی انہیں لوگوں میں شامل تھا۔ ذیل میں اس عہد کے شعراء کے حالات اور اُن کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

ولی

جنوبی ہند میں ولی نام کے دو شاعر گذرے ہیں اور نام کے اسی اشتراک سے بعض تذکرہ نویسوں نے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں خصوصاً یورپی مصنفین نے۔ چنانچہ "بلوم ہارٹ" سے بھی یہی غلطی ہوئی ہے اور اس نے ولی نام کے دونوں شاعروں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ ایک ولی ویلور (علاقہ مدراس) کا رہنے والا تھا جو مشہور نظم "روضۃ الشہداء" کا مصنف تھا۔ اور دوسرا ولی جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کرنا چاہتے ہیں اورنگ آباد کا رہنے والا تھا۔

ولی اورنگ آبادی سنہ ۱۰۶۳ھ میں پیدا ہوا۔ اورنگ آباد اور گجرات میں تعلیم حاصل کی۔ شمالی ہند کا بھی سفر کیا اور پہلے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اور پھر محمد شاہ کے زمانے میں دلی گیا۔ ولی کو دلی میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس کے کلام کی بے انتہا قدرافزائی ہوئی اور ایک خیال کے مطابق ولی کے رسیلے نغموں نے اہل دلی کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بھی اسی کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔ مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیقات کے مطابق سنہ ۱۱۱۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ولی اپنے عہد کا بہت بڑا شاعر تھا۔ نہ صرف اپنے عہد کا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے پہلے اور عرصہ تک اس کے بعد کے عہد میں بھی اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ باوجودیکہ ولی اورنگ آباد (جنوبی ہند) کا رہنے والا تھا اور آج سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ مگر اس کی زبان اور بیان اس عہد سے مختلف اور بہت حد تک آج کی زبان اور بیان سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے بیان کردہ موضوعات میں سے بیشتر آج کی شاعری میں مستعمل ہیں۔ اس کے الفاظ اور تراکیب (چند مخصوص الفاظ سے قطع نظر) اور سب سے بڑھ کر اس کا اسلوب بھی بہت حد تک موجودہ

---

[1] "اردو شہ پارے" ص ۱۴۹

عہد سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس سے اُس کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُس کے یہاں بہت لوچ، نرمی، حلاوت اور رسیلا پن ہے۔ اس کی زبان بہت پیاری اور دلکش ہے، سادگی اور بے تکلفی اُس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اُس کی شاعری کے سرمایہ میں ہمیں غزل، قصیدہ، مثنوی، رُباعی، قطعہ، مخمس، مستزاد اور ترجیع بند ملتے ہیں۔ جن میں اولیت کا سہرا غزل کو حاصل ہے اور پھر قصائد اور مثنویات کا نمبر آتا ہے۔ ذیل میں ولی کے کلام میں سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ پہلے غزلوں کا انتخاب دیکھئے۔

اے چمن زارِ حیا دل کے گلستاں میں آ
نا دیتا نہیں گر رخصتِ گل گشتِ چمن

بندہ مت ہو سبحۂ زنّار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی

کبھو بے خود کبھو ہشیار ہم ہیں
شرابِ شوق سوں سرشار ہم ہیں

مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے
ولی اُس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی

نگاہِ پاکبازاں کیمیا ہے
غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے

مثنوی

در تعریفِ شہر سورت

بلاشک وہ ہے جگ میں مقصدِ دہر
عجب شہراں میں ہے پر نور یک شہر

رہے مشہور اس کا نام سورت | کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب | ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب
کنارے اس کے اک دریا ہے بہتی | کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے چپکتی
شہر سوں ہے وہ ہم باز و ہمیشہ | دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر | ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر

ضعیفی ضعیفی کا نام شیخ داؤد تھا۔ قطب شاہیوں کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے زہد و تقویٰ سے فطری لگاؤ تھا۔ صوفی منش آدمی تھے۔ دو مثنویوں "ہدایت نامہ" اور "عشق صادق" کے مصنف تھے۔ ان کی مثنویاں بھی ان کے مذہبی خیالات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی زبان اس عہد کی زبان سے قدرے مختلف ہے۔ انھوں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ کچھ بھاری بھرکم اور ثقیل ہیں صفائی اور سلاست کم ہے۔ ان کی مثنویوں میں ادبیت کی زیادہ چاشنی نہ سہی لیکن انھیں ادب سے بالکل بیگانہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری کا خیال ہے کہ "عشق صادق" میں جہاں عورتوں کی گفتگو قلمبند کی گئی ہے وہاں ہندی کے الفاظ اور محاورات بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "اس زمانے میں عورتوں کی زبان مردوں سے مختلف تھی"۔ ذیل میں ضعیفی کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

نبی ایک روز پیغمبر راہ پر | گئے تھے جو اطراف کنن گذر
سو دیکھے یہودی کون آتا ہوا | مگر ایک ہرن کوں لاتا ہوا
یکا یک ہرن نے زباں کھول کر | نبی سات وہ رمز دا بول کر

لے "کلیات ولی" مرتبہ مولانا احسن مارہروی

کبھی یوں کہ اے خاصِ خیر البشر — میرا بند چھوڑ آنکھ اے بول کر
تمہیں لک مرے واسطے ہو زباں — زباں ہو نہنچی تک دلاؤ اماں

امین ان کا نام شیخ محمد امین اور تخلص امین ہے۔ گجرات میں پیدا ہوئے مگر اورنگ آباد میں بھی قیام رہا۔ اورنگ زیب کا زمانہ پایا تھا ایک مثنوی "یوسف زلیخا" کے مصنف تھے یہ مثنوی ۱۱۰۹ھ لکھی گئی۔ اس کے متعلق خیال یہ ہے کہ یہ فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امین کو مذہب سے لگاؤ تھا۔ اس کی زبان میں کوئی گنجلک نہیں ہے۔ ذیل میں اس کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

زلیخا کی حقیقت اب سنا دے — زلیخا پھر کے یوسف کوں پاوے
زلیخا بیخبر پھرتی رتی تھی — عشق کا گھاؤں اور بستی تھی
کدھوں گھر میں کدھوں جنگل میں جاتی — دے بخت کے دنوں کو یوں گنواتی

ذوقی یہ بھی عہد عالمگیر کے شاعر تھے۔ سید حسین شاہ نام، ذوقی تخلص۔ مزاج میں تعلّی کا مادہ بہت تھا۔ بہت کم شعرا کو خاطر میں لاتے تھے اور اپنے آپ کو نصرتی سے بھی اونچا سمجھتے تھے، مذہب کے دلدادہ تھے۔ ان کی تصانیف بھی اس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کئی مثنویوں "وصال العاشقین"، "منصور نامہ"، "وفات نامہ"، "غوث نامہ" اور "ماں باپ" کے مصنف تھے۔ کچھ غزلیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ ان کے کلام میں دلکشی کم ہے مگر پختگی اور کہنہ مشقی ضرور ہے ان کے مرثیوں کا انداز غزل کا سا ہوتا ہے زبان کی سلاست اور صفائی قابلِ تعریف ہے ذیل میں ان کے مرثیہ کے کچھ شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

اے شمع بزمِ مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں — تاریک ہے تم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں
وہ جاہلِ دوزخ وطن آئی ہیں یا دل کے بن — جوں برق تیغِ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں

وہ شمع بزم مصطفےٰ بادل اجل سوں تن سدا یاراں لگاتے کیوں اپنا[1]　　سب سوز دل سوں گل ہوا

بحری | بحری بھی عالمگیر کے عہد کا شاعر تھا قاضی محمود نام تھا پہلے سکندر عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا مگر جب اورنگ زیب نے جنوبی ہند کو تسخیر کیا تو اس کے مصائب کا زمانہ شروع ہوا۔ اب بیجاپور سے حیدرآباد جاتے ہوئے راہ زنوں کے ہاتھوں لوٹا گیا۔ حیدرآباد میں بھی سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ اورنگ زیب کے بعد بھی زندہ رہا۔ ایک مثنوی "من لگن" کا مصنف تھا۔ یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ کی تصنیف ہے۔ کچھ غزلیں، مرثیے، اور رباعیاں بھی لکھیں مگر یہ سب چوروں کی دست درازی کی نذر ہو گئیں۔ بحری کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا بہت اچھا شاعر تھا۔ مگر الفاظ بہت مشکل استعمال کرتا تھا۔ ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

اے روپ ترا ارتی رتی ہے　　پربتا پربت رتی رتی ہے

رشا اے قلم اس گھڑی نہ گھبرا جائیں　　ٹک تخت نگر کی سیر کرائیں

ہے نام ز احمد نشان احمد　　سرجی سو احد ہے پاں احمد

مجرمی | ان کا نام شاہ عبداللہ اور وطن بیجاپور تھا۔ ایک مثنوی "گلشن حسن و دل" کے مصنف تھے۔ اس مثنوی میں وجہی کی "سب رس" کو منظوم صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں اس کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

زباں اور نظر دونوں مل یار ہو　　چلے ہیں تماشے کو اک ٹھار ہو

چلے جب تماشے کو مل کے ملوک　　تو دیکھے ہنر کر کو کیتے سلوک

وجدی | ان کا نام شیخ وجہ الدین تھا۔ کرنول کے رہنے والے تھے، فرید الدین عطا

---

[1] "یورپ میں دکھنی مخطوطات" ص ۴۴۱　　[2] اردو شہ پارے ص ۳۰۶

کی مشہورِ زمانہ مثنوی "منطق الطیر" کا دکھنی اردو میں ترجمہ کیا ہے اور "پنچھی باچھا" نام رکھا ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۴۶ھ میں لکھی گئی تھی۔ دو اور مثنویوں "باغ جانفزا" اور مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کے بھی مصنف تھے۔ یہ دونوں مثنویاں بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اور علی الترتیب سنہ ۱۱۴۵ھ اور سنہ ۱۱۵۳ھ کی تصنیف ہیں۔ وجدی کے کلام کی روانی اور برجستگی قابلِ تعریف ہے۔ اسلوب اور زبان بھی اچھی ہے۔ ذیل میں "پنچھی باچھا" کے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اصل میں یو تھا کلام فارسی — اہلِ معنی کو مثالِ آرسی
خوشتریں تصنیف شیخِ نامدار — پیشوائے عارفانِ روزگار
شیخ صاحبدل فرید نامور — خاص جن کا ہے لقب عطار کر
تھا دلے جوں فارسی میں یو کلام — کم سمجھ سکتے تھے اسکو خاص عام
قصد کر دکھنی زباں میں لاکے آؤں — تا رہے دنیا منے میرا بھی ناؤں[1]

اشرف[2]

ان کا نام ہی ان کا تخلص تھا، ولی کے ہم عصر تھے، مرثیہ، مثنوی اور غزل میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے مرثیوں اور مثنویوں دونوں میں ان کا مقام بہت اونچا ہے "جنگ نامہ" کے مصنف تھے اس مثنوی کے اختتام پر انہوں نے خود اس کا سنِ تصنیف سنہ ۱۱۲۵ھ مطابق سنہ ۱۷۱۳ء لکھا ہے۔ باوجودیکہ انہوں نے خالص مذہبی موضوعات کو چھیڑا ہے مگر اس کے باوجود اس میں دلکشی ہے۔ اسلوب بھی پسندیدہ ہے۔ جذباتِ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ ذیل میں ان کے ایک مرثیے میں سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔ یہ حضرت شہر بانو کے بیان غم سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] دکن میں اردو ص ۲۳ [2] اردوئے قدیم ص ۹۲-۹۳

بالو کہیں اصغر نہیں اب میں جھولاؤں کس کے تئیں
سونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پنا اس کوں بناتی گل نمن
وہ پھول سوکھا نیربن اب میں بناؤں کس کے تئیں
سوتا تھا جب وہ نیند بھر پینے اُٹھاتی دودکوں
بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں

عشرتی ان کا نام سید محمد خاں اور عشرتی تخلص تھا۔ خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ عشرتی کے والد بصرہ کے راستے دکن آئے اور پھر یہیں مقیم ہو گئے۔ عشرتی پہلے عادل شاہی اور پھر عالم گیری دربار سے متعلق رہے اور دونوں درباروں میں بہت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ صاحب علم و فضل اور شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ کئی مثنویاں دیپک پتنگ، چیت لگن، نیہ درپن اور بہت سی غزلیں لکھیں۔ بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ درد و غم کے جذبات بیان کرنے میں کمال حاصل تھا ذیل میں اُن کی مشہور مثنوی چیت لگن سے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں،

لکھیا دل کے لہو سوں یو نامہ تجے
جو تج بن دسیا دن قیامت مجے
تیری زلفِ مشکیں کی سوگند ہے
کبھی کہہ ب میں جس جیو کا یک بند ہے
کہ جب تے انکھیاں لہو بھریاں نامبود
رہیاں تیری موکے پہول بن سوں دور

قاسم احمد اس کے نام کے متعلق تذکرہ نویسوں میں کسی قدر اختلاف ہے میر حسن اور قاسم اسے احمد گجراتی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مصنف عیار الشعراء

ؔ اردو شہ پارے جلد اوّل صفحہ ۲۷

کے خیال میں اس کا نام غلام احمد علی تھا۔ مگر جدید تحقیقات کی رو سے اس کا نام تیم احمد تھا۔ برہان پور کا باشندہ تھا۔ مرثیہ گوئی سے خاص شغف تھا۔ اس کی شعری کائنات میں مرثیہ ہی ملتے ہیں جن میں سے بعض جذبات نگاری کے اعتبار سے اعلیٰ پائے کے ہیں مگر زبان کسی قدر مشکل اور پیچ دار ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

حیف گھائل ہے حسین تن تیرا — جسم پر خون ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہوا کید ہر تن تیرا — کیوں بسیرا ہوا ہے دن تیرا
نہیں ملتا بوند کسی کتیں پانی
سخت طفلاں کے سر پہ حیرانی[1]

ندیم پورا نام سید شاہ ندیم اللہ حسینی تھا ندیم تخلص کرتے تھے۔ بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ مرثیے کے میدان میں خاصہ نام پیدا کیا۔ زبان اور اثر کے اعتبار سے ان کے مرثیہ قابلِ تعریف . . . ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

ہے ہے اصغر اے حسین سونا تیرا پالنا — رو رو بانو کرتے ہیں بین سونا تیرا پالنا
تجھ بن بانو ہیں بے حال الجھے بکھرے سر کے بال — کہتے ہیں ہے میرا لال، سونا تیرا پالنا
تھا تو شہ کا من کا چاؤ تجھ دکھیا کے من کا بھاؤ — کاری ہے مجھ دل پر گھاؤ، سونا تیرا پالنا

دیگر شعرا اس عہد کے دیگر شعرا کے حالاتِ زندگی ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں اس لئے ذیل میں ان کے کلام کا نمونہ مع اُن کے اسم ہائے گرامی درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

پی سے جدا ہونا نہ تھا، چاہا خدا یا یوں ہوا — جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہور رہنا پڑا
(بیچارہ گولکنڈہ)

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۳۸۱

ہمنا کے خونِ چشم سے آلودہ کب کرے
وہ پگ جیسے گرانی ہے رنگِ حنا سستی

(طالب گولکنڈہ)

فراقی کشتہ ہوں اس کا ن کا جسد م کہ وہ ظالم
کمر سے کھینچا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

(فراقی)

عہدِ مغلیہ کی اُردو پر تبصرہ

مغلیہ عہد کے اُردو شعرا کے حالاتِ زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کے نمونے آپ دیکھ چکے۔ اُن کی زبان و بیان اور موضوعات کا تذکرہ بھی پڑھ لیا۔ اس سے کم از کم اتنا اندازہ تو ضرور ہو گیا۔ کہ یہ دور گذشتہ تمام ادوار کے مقابلے میں اُردو زبان و ادب کے لئے حیات بخش تھا۔ یہی دور تھا جس میں اُردو زبان کا وہ کمال شاعر پیدا ہوا جسے عرصہ دراز تک اُردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا رہا۔ یعنی ولی اورنگ آبادی جس کی زبان نہایت صاف، سادہ اور سلجھی ہوئی تھی۔ اتنی صاف اور سادہ کہ اس سے پہلے کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اور اُس کے بعد بھی عرصے تک کوئی اُس کی تقلید کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کا بیان بہت شیریں تھا۔ اُس کے نغمے بڑے لوچ دار تھے۔ اُس نے غزل کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ غزل ولی سے پہلے بھی کہی جاتی رہی۔ مگر اس سے پہلے اُس کی حیثیت اتنی اہم اور پائیدار نہیں تھی۔ گویا مغلیہ عہد اس اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں غزل پروان چڑھی اور ولی نے اُس کے سانچے بنانے اور اظہار کے نئے نئے اسالیب دینے میں قابلِ ذکر اور قابلِ قدر کام کیا۔ اس عہد میں مثنویوں کا بھی خاصہ دفتر تخلیق ہوا مثلاً رضوان شاہ و روح افزا، من لگن، منطق الطیر، یوسف زلیخا، اور عشقِ صادق۔ اس عہد کی مثنویوں میں

سے اُردو شہ پارے جلد اول ص ۳۱۹

حسن وعشق کی داستانیں بھی بیان کی گئیں. گو ان پر تصوف کا رنگ چڑھایا گیا۔ مگر آنے والے مثنوی نگاروں کے لئے راستہ ضرور بن گیا۔ اس عہد کی مثنویوں کی زبان دوسری اصنافِ سخن کی طرح نسبتاً صاف اور سلیس ہے۔ مغلیہ عہد میں غزل اور مثنوی کے ساتھ ساتھ مرثیہ گوئی بھی جاری رہی اور روحی، ذوقی، اشرف، ندیم اور رتیم احمد کے مرثیہ اسی عہد کی یادگار ہیں ان میں سے بعض مرثیے سوز و گداز، جذبات نگاری اور اثر آفرینی کے اعتبار سے اُردو ادب میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں خصوصاً ندیم اور رتیم احمد کے مرثیہ۔ البتہ اس دور میں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ نثر کا میدان بالکل صاف نظر آتا ہے۔ شاید ایسا نہ ہو اور نثر کی طرف بھی توجہ دی گئی ہو مگر اس وقت تک اُس دور کی نثر کا ایک نمونہ بھی نہیں مل سکا۔

سلطنتِ آصفیہ — اور اُردو

اورنگ زیب عالم گیر کی آنکھ بند ہوتے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی عظمت و اقبال کا آفتاب بھی غروب ہوگیا۔ وسیع و عریض سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ صوبیداروں نے سرکشی کی اور مرکز سے قطع تعلق کرکے اپنے اپنے صوبوں میں خود مختار ہوگئے۔ جنوبی ہند بھی اس افراتفری سے نہ بچ سکا۔ اور مرہٹے، نوابانِ اراکاٹ، فرانسیسی اور حیدرآباد کے نوابوں نے جنوبی ہند کے مختلف حصوں پر قبضہ کرلیا۔ نظام الملک آصف جاہ حیدرآباد دکن کے پہلے خود مختار والی تھے۔ جنھوں نے مرکز کی حالت کمزور دیکھ کر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لی اور ۱۱۳۶ھ میں حیدرآباد کی مسندِ حکومت پر قدم رکھا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کا آغاز ہوا۔ اس خاندان میں دس فرماں روا گذرے۔ آخری فرماں روا نواب عثمان علی خاں ہیں جو تقسیم ہند کے بعد برائے نام حکمراں رہ گئے ہیں۔ شاید نواب موصوف کے انتقال کے بعد یہ برائے نام حکمرانی بھی ختم ہو جائے گی۔

عہدِ آصفیہ میں اُردو کی ترقی

عہدِ آصفیہ میں اُردو زبان و ادب نے غیر معمولی ترقی کی، چونکہ خاندانِ آصفیہ کے فرماں روا خود بہت علم دوست، ادب نواز اور بعض خود شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے عہدِ حکومت میں علماء و فضلا اور شعراء ادباء کا جمگھٹا ہوگیا۔ آصف جاہ اول اور اُن کے بیٹے نواب ناصر جنگ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ نواب محبوب علی خاں

مرحوم بھی شعر کہتے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔ موجودہ فرماں روائے حیدرآباد نواب عثمان علی خاں بھی شعر و سخن سے رغبت رکھتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ مشہور شاعر جلیل مانک پوری کے شاگرد ہیں۔ یہ اس خاندان کی علم دوستی اور شعراء و ادبا کی قدردانی کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے علماء و فضلاء کو کھینچ بلایا۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں جو مختلف فرماں رواؤں کے عہدِ حکومت میں حیدرآباد کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، منشی امیر مینائی، نواب مرزا خاں داغ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر، نواب محسن الملک، مولانا شبلی، نواب وقار الملک، مولوی میر مہدی علی، نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بلگرامی، مولانا ظفر علی خاں مولانا غلام قادر گرامی، مولوی عبدالحق، جلیل مانکپوری، جوش ملیح آبادی اور دوسرے۔

عہد آصفیہ میں سرزمین حیدرآباد سے بھی بڑے اچھے اچھے شاعر اور نثر نگار اُٹھے جن کے علمی و ادبی اور شعری کارنامے اُردو زبان و ادب میں گراں بہا اضافے کا درجہ رکھتے ہیں ذیل میں اس عہد کے شعراء و ادبا کے تمام حالاتِ زندگی بیان کرنا اور اُن کے کلام کے نمونے دکھا کر ان پر تنقید و تبصرہ کا حق ادا کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس لئے چند قابلِ ذکر شعراء اور نثر نگاروں کو موضوعِ گفتگو بنایا جائے گا۔

آصف ان کا نام نواب میر قمرالدین خاں ہے۔ شاہجہاں کے وزیرِ اعظم نواب سعداللہ خاں کے نواسے تھے۔ ۱۰۹۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے تعلق رکھتے تھے اور ترقی کرتے کرتے چہار ہزاری کے منصب تک پہونچے۔ بہادر شاہ کے عہدِ حکومت میں اودھ کی صوبیداری اور

لکھنؤ کی فوجداری کے مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ جب فرخ سیر بادشاہ ہوا تو اُسی نے انھیں نظام الملک فتح جنگ کا خطاب دے کر حیدرآباد دکن کا صوبیدار مقرر کیا۔ فرخ سیر کے قتل کے بعد جب محمد شاہ بادشاہ ہوا تو نظام الملک آصف جاہ دکن سے تبدیل کر کے سنبھل و مرادآباد کی فوجداری کے منصب پر بھیج دئے گئے۔ اس کے بعد مالوہ کی صوبیداری ملی۔ مگر مرکز کی حالت انتہائی کمزور تھی۔ بادشاہ نالائق اور کم ہمت تھا۔ امرا و وزرا کے مابین حصولِ اقتدار کے لئے کشمکش جاری تھی اور بعض اوقات اس کشمکش کے نتائج انتہائی افسوسناک نکلتے تھے۔ آخر نظام الملک مالوہ سے دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت تک عمادالملک مبارز خاں یہاں کا صوبیدار تھا اُس نے نظام الملک کا راستہ روکا۔ شکر کھیڑہ کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی جس میں فتح کا سہرا نظام الملک کے سر بندھا۔ اس واقعہ کے بعد دکن میں آصفجاہی خاندان کی بنیاد پڑی اور نظام الملک اس کے پہلے آزاد اور خودمختار فرماں روا ہوئے۔

آصف جاہ اعلیٰ پایہ کے منتظم اور مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ علماء فضلاء اور شعراء و ادباء کے سرپرست اور قدرداں تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شاکر اور آصف تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں عبدالقادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے۔ ذیل میں اُن کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

کالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کو حسد سے ۔۔۔ مجھ دل کن یہ دُعا ئے یمنی ہے

ناصر — نظام الملک آصف جاہ کے فرزند تھے اور اُن کے انتقال کے بعد ۱۱۶۱ھ میں تخت نشیں ہوئے اور تین سال حکومت کرنے کے بعد ۱۱۶۴ھ میں فوت ہو گئے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونۂ کلام

درج ذیل ہے۔

اے کبوتر جا کہ یوسف کو کہہ گھر سے نکل — چاہ سے تیری زلیخا ہو گئی ہے باولی
یار خورشید جہاں تھا یہ مجھے معلوم نہ تھا — ذرہ ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سراج | سید سراج الدین نام۔ سراج تخلص۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ۱۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے ۱۱۷۷ھ میں فوت ہو گئے۔ صوفی منش آدمی تھے۔ ولی کے بعد سرزمینِ دکن سے اس پایہ کا شاعر نہیں اٹھا۔ سراج کے کلام میں تصوف بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ ہلکا ہلکا درد اُن کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی اپنے عہد کے بہت سے لوگوں سے آگے ہیں۔ خیالات میں بلندی، طرزِ ادا میں بیساختگی اور مضامین میں تنوع ہے۔ انھوں نے بہت سی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، غزل، رباعی، مثنوی، مخمس اور ترجیع بند ذیل ان کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

آہِ سوزاں ہو گئی ہر دامنِ صحرا میں سراج — قبرِ مجنوں پہ چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا
ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشمِ مست میں — شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا
شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا — مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

صارم | میر عبدالحی خاں نام صمصام الملک خطاب اورنگ آباد کے باشندے تھے ۱۱۴۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۲ھ میں وفات پائی۔ حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق تھا۔ صارم تخلص کرتے تھے "تذکرہ شعرائے دکن" میں ان کے کلام کا نمونہ درج کیا گیا ہے۔ صرف ایک شعر نقل

یورپ میں دکھنی مخطوطات ص۲۴۹ سے گلِ عجائب یعنی تذکرہ شعرائے اردو تالیف اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی

کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

نہیں کھلتا بہا او باغ سوں دل | یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

ابدال — انکا نام مرزا ابدال بیگ تھا اور ابدال تخلص۔ وطن برہان پور تھا اپنے عہد کے بہت اچھے شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے کلام میں بے ساختگی اور زبان میں سلاست ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

غمزہ سیں مارتا ہے جلاتا ہے ناز سیں | کیا ملک حسن کا صنما تو خدا ہوا

خاکی — ان کا نام سید محمد قادری ہے۔ خاکی تخلص کرتے تھے۔ اپنی ریختی کے لئے مشہور ہیں اور اسی حیثیت سے قابل ذکر ہیں تمکین نے اپنے "تذکرۂ ریختی" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں ان کی ریختی کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

بیابن اے سہیلی انجنوں سی مکہ دھوتی ہوں | کبھی میں ہتنیع گر اند ہار ادیکھ روتی ہوں

محرم متوفی ۱۱۶۶ھ — ماہ محمد نام، معظم خاں خطاب، محرم تخلص۔ دکن کے اچھے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

شاخ کی مینا کو کس شوخ جی ہلاتی ہے بہار | گل پہ شبنم نہیں اس کو بے پلاتی ہے بہار

مرزا داؤد متوفی ۱۱۶۸ھ وطن اورنگ آباد — صرف نمونۂ کلام درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ دیکھئے کتنا صاف اور اچھوتا شعر ہے۔

مرا احوال چشم یار سے پوچھ | حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

ایما متوفی ۱۱۷۲ھ — ان کا نام عاشق علی خاں تھا۔ نظام الملک کے دربار سے وابستہ تھے نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

طبیب عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا | کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

عاصی متوفی ۱۱۷۵ھ ان کا نام نور محمد تھا عاصی تخلص کرتے تھے۔ برہان پور وطن تھا۔ سرکار آصفیہ سے متعلق تھے۔

سمجھے ہیں ہم کہ اب کہیں تم نے دل دیا — بیٹھے کہیں ہو بات کہیں ہے نظر کہیں

مہر متوفی ۱۱۷۸ھ ان کا نام مہر علی تھا۔ مہر تخلص کرتے تھے بہت خوش گو شاعر تھے نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

پڑھ نماز یار تو ہر وقت رندوں کو نہ چھیڑ — تجھ کو اے زاہد پرائی کیا پڑی اپنی نبیھڑ

عاجز دکن میں اس نام کے دو شاعر گذرے ہیں ایک سید محمد عاجز مصنف "قصہ ملکہ مصر" اور دوسرے عارف الدین خاں عاجز جو اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع ہیں۔ عارف الدین خاں عاجز کے والد بلخ سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے اور اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے۔ یہیں عاجز پیدا ہوئے۔ اور بن شعور کو پہونچ کر دربارِ آصفیہ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۱۷۸ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ عاجز جنوبی ہند کے مشہور شاعر تھے۔ علم و فضل میں بھی کامل تھے اور بقول تمنا اورنگ آبادی (مصنف گل عجائب) "بر جمیع علوم کسبی و وہبی قادر بود و تمامی فنون شریفیہ را ماہر"۔ مشہور مثنوی "لال و گوہر" انھیں کی تصنیف ہے۔ اس کی زبان نہایت سلیس اور صاف ہے۔ غزلیں بھی لکھیں اور ان میں بھی بعض شعر تو اتنے اونچے لکھے کہ عام شاعر کا ذہن وہاں تک مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

عاشقِ وحشی کی گر تصویر کھینچا چاہیے — اول اُس کے پانو میں زنجیر کھینچا چاہیے

چمن میں جاکے دیکھیں ادا جب مسکراتا ہے — گلوں سے رنگ اوڑ کر لال سا جنگل کو جاتا ہے

فضلی متوفی ۱۱۸۴ھ شاہ فضل اللہ نام، فضلی تخلص والد کا نام سید عطا اللہ اورنگ آباد وطن۔۔۔۔ پریم لوکا قصہ "برہ بھبھوکا" اور رسالہ "زادِ راہ" کے مصنف تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

تجھ ملاحت کے لون کی لذت　　جس کا دل ہو کباب کیا جانے[1]

یار و شیدا یہ دونوں بھی اسی عہد کے شاعر تھے اور حیدرآباد کے امراء میں سے تھے یار کا نام احمد یار خاں اور ممتاز جنگ خطاب تھا۔ ۱۱۸۵ھ میں انتقال ہوا۔ شیدا کا نام نوازش علی خاں بہادر تھا۔ کئی طویل مثنویوں کے مصنف تھے ۱۱۷۲ھ میں فوت ہوئے نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

باغ میں کہتی تھی بلبل ہائے ہائے اب تک پڑی　　دل جلا میرا تب اس گل کی تپش ٹھنڈک پڑی[2]

(یار)

اگرچہ کہتے تھے قمریاں سب چمن میں اشرف ثمر سا نہیں　　جب ہم نے تحقیق کر کے دیکھا تمہارے قد کا غلام ہے وہ

(شیدا)

قیاسی و دردمند قیاسی کا نام سید عبد اللہ تھا ایک سوداگر کی حسینی و جمیل بیوی کے قصہ کا مصنف ہے۔ دردمند کا نام محمد فقیہ، اورنگ آباد (سید) وطن، دہلی بھی گئے تھے اور وہیں مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد ہو گئے تھے۔[3] نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

قصہ کہتا ہوں میں عجب گوہر سار کا　　کیسے کرے ہے چھند او دیکھو تماشا نار کا

کہتا ہوں سنو چھند یکنار کا　　جیسے سمندر چتر جو سار کا

کہتے ہیں جو ایک شہر میں بختوار　　اتھا ایک سوداگری نامدار

اوسے ایک عورت تھی صاحب جمال　　پریاں میں نہیں کوئی اس کی مثال[4]

(مثنوی قیاسی)

ساقی نامہ

اوسے ساقی اے جانِ فصلِ بہار　　یہی تھا ہمارا و تیرا قرار

۱؎ گلِ عجائب ص۱۲۲　۲؎ گلِ عجائب ص۱۲۹　۳؎ دکن میں اردو ص۲۶۸　۴؎ یورپ میں دکھنی مخطوطات ص۵۰۸

ہمارے بسر نیں کی یہ فصل ہے   فراموش کرنے کی یہ فصل ہے
کہ میں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح   لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح

(دردمند)

ساؔمی ساؔمی بھی اسی عہد کے شاعر تھے غلام قادر نام تھا ساؔمی تخلص کرتے تھے۔ وطن اورنگ آباد تھا۔ شاعری اور خوشنویسی دونوں سے شغف تھا۔ ایک مثنوی "سرو شمشاد" کے مصنف تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

ہمیں کیا جاؤ چل کر باغ و بستاں   کہ ہے کنج قفس ہم کو گلستاں
طبیبوں کو عبث دیتے ہو آزار   بنے ہیں ہم غم ہجراں کے بیمار
زبس ہیں روز و شب مشتاق دیدار   یہ دو مخمور ہیں گوشے میں ہمار

عزلؔت عزلؔت نہ صرف جنوبی ہند کے بلکہ ہندوستان کے بہت بڑے اور مشہور شاعر تھے۔ ان کا نام سید عبدالولی اور عزلؔت تخلص ہے۔ والد کا نام سید سعد اللہ ہے جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ عزلؔت سنہ ۱۱۰۴ھ میں بمقام سورت پیدا ہوئے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا آبائی وطن بریلی قرار دیا ہے اور بعض کے خیال میں مضافات لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے دہلی اور مرشد آباد بھی گئے تھے۔ مرشد آباد کے نواب علی وردی خاں نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی تھی اور سرپرستی فرمائی تھی۔ علی وردی خاں کے انتقال کے بعد عزلت دکن چلے آئے جہاں نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور آخر تک ان پر مہربان رہے۔ ..... سنہ ۱۱۸۹ھ میں فوت ہو گئے۔ بہت زندہ دل رنگین مزاج اور صوفی منش بزرگ تھے۔ شاعری کے علاوہ خوشنویسی مصوری اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ فن موسیقی پر ایک معلوماتی کتاب "راگ مالا" بھی لکھی ہے جس میں چھ راگ اور ہر راگ میں پانچ راگنیوں کا بیان ہے۔ غزلوں

کا ایک مجموعہ بھی انھیں کی تصنیف ہے اور چند رباعیاں بھی۔ "ساقی نامہ" اور "بارہ ماسی" بھی غزلیات ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ بہت باکمال اور پختہ کار شاعر تھے کلام میں بھی بہت رنگینی ہے۔ ذیل میں نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

خواب میں بوسی کو تیرے اون لبوں سے جنگ تھا | صبح کو دیکھا تو اون لعلوں کا تو رنگ تھا
سختِ پستاں چبھے مرے دل میں | اپنے ہاتھوں سے میں خراب ہوا
آج دل بے قرار ہے میرا | کس کے پہلو میں یار ہے میرا [1]

لطفی و مہتاب لطفی کا نام میر لطف علی خاں تھا سنہ ۱۲۰۰ھ میں انتقال ہوا۔ مثنوی بہلول صادق کے مصنف ہے مہتاب کا نام لالہ بولال تھا سنہ ۱۲۱۰ھ میں فوت ہوئے اپنے دور کے بہت اچھے شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے

بیان کرتا ہیں وہی مردِ صادق | وفا محبوب کا اور مردِ عاشق
عشق کے بات سن کر جنہوں ہے | وفا معشوق میں نادرست ہے
شہر ہی ایک ہندوستانیے خوش | کہ ہی مشہور اس ای بنارس
بہی ہندوان کا دی قبلہ ہوا ہے | تمام عالم میں شہرت ہوا ہے [2]

(قصہ بہلول صادق از لطفی)

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند | جل گیا جی کباب کی سوگند
ہر گھڑی تو قسم نہ کھا جھوٹی | تجکو دل کی کتاب کی سوگند [3]

([illegible])

حمید و محمود خواجہ خاں حمید اپنے تذکرہ شعرائے اردو "گلشن گفتار" کی وجہ سے بہت مشہور ہیں ان کے والد امرائے حیدرآباد میں سے تھے۔ وطن اورنگ آباد تھا شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور عارف الدین

---

[1] گل عجائب ص ۱۰۰-۹۹ [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۴۱۵ [3] دکن میں اردو ص ۲۷۲

عاجز کے شاگرد تھے۔ ایک مثنوی "ملکۂ مصر" کے مصنف تھے یہ مثنوی ۱۲۰۶ھ کی تصنیف ہے۔ ذیل میں ان دونوں شاعروں کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

زلف خم ہو کے ٹک جان کو سنبالی ہیں رات　　مو بہ مو کھول کے حال پریشان ترا

(حمید)

قصۂ ملکۂ مصر

یو سب بات سن کر او تادی پھسل　　کہے کون جنت میں جاویں اگل
ملایک بجز ہیں مرد یا عورتاں　　کہو مجھ سوں دو حرف کر ابیان
کہا جانے کی سو اول بہشت میں　　کہ وہ ایک محمد کے امت میں
فرشتے نہیں مرد عورت کے سار　　ولیکن نہیں ادب قدرت سوں بار

(محمود)

شفیق ان کا نام لالہ لچھمن نرائن تھا۔ ۱۱۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ صاحب تخلص کرتے تھے پھر شفیق منتخب کیا۔ اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ مگر اُن کی شہرت شاعر سے زیادہ ایک اچھے تذکرہ نویس کی حیثیت سے ہوئی۔ انھوں نے فارسی اور اُردو شعرا کے دو تذکرے لکھے "گل رعنا" فارسی گو شعرا کے بیان میں اور "چمنستان شعرا" اُردو گو شعرا کے حال میں۔ "چمنستان شعرا" ۱۱۷۵ھ میں تصنیف ہوا۔ ایک مثنوی "تصویر جاناں" کے بھی مصنف تھے۔ وفات کی صحیح تاریخ کا علم نہیں ہے نصیر الدین ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ "غالباً ۱۲۱۵ھ کے بعد شفیق کا انتقال ہوا"۔ ذیل میں اُن کے کلام

ؔ یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۳۳۹

کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

عاشقی نے کر دیا دونوں جہاں میں نامور
مر گئے ہیں ورنہ مجنوں سے یہاں لاکھوں گزر

ایجاد ان کا نام مرزا علی تقی خاں اور تخلص ایجاد تھا۔ والد کا نام نقد علی خاں تھا۔ ایجاد اور ان کے والد دونوں سرکار آصف جاہ سے وابستہ تھے۔

ایجاد اردو کے علاوہ فارسی کے بھی شاعر تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہی تھا۔ کیونکہ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ مگر چونکہ بہت نکتہ رس اور دقیقہ شناس تھے اس لئے اردو میں بھی اچھے اچھے شعر نکال لیتے تھے۔ تمنا اورنگ آبادی نے بھی اپنے تذکرہ میں انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"غزل فارسیش چوں زلفِ خوباں مسلسل و مضامین تازہ ہااش از رخسارۂ محبوبان(۱) بدل۔ ریختہ اگرچہ زبانش نیست فاما بزورِ طبیعت دقیقہ شناس بحسنِ کیفیت سحر انجام می دہد"۔ ذیل میں ان کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

آج آنے سے ترے دل ہوا یوں شاد کہ بس
اس خرابے کو تو ایسا کیا آباد کہ بس

رات شیشہ کو جھکاتے ہی بھری مجلس میں
اس مزے سے مجھے ساقی نے کیا یاد کہ بس

مہربان و بیکل مہربان کا نام میر عبدالقادر تھا ۱۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وطن اورنگ آباد تھا اپنے معاصرین میں علم و فضل اور شعر و سخن کے اعتبار سے بہت امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

بیکل کا نام میر عبدالوہاب تھا۔ دولت آباد میں پیدا ہوئے۔ ایک کتاب "بے نظیر" کے مصنف تھے یہ شعراء کا تذکرہ ہے مگر نایاب ہے۔ مہربان اور بیکل دونوں مولانا

۱؎ گلِ عجائب ص۲

غلام علی آزاد کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے

خدا محشر میں لیوے داد قاتل سے مری لیکن | سبب جس دل کی میں مارا گیا اُس سے خدا پوچھے[۱]

شعلہ رویوں کی بھویں ہر وقت رہتی ہیں کھچی | کیا کمانیں ہیں کہ آتش میں بھی نہیں چھوڑی کجی

پیر مرشد کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا | سرخ و سفید ماٹی کی مورت ہوئی تو کیا[۲]

عروج و انور

عروج کا نام میر بہاؤ الدین حسین خاں تھا۔ ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے وطن اورنگ آباد تھا۔ انور کا نام محمد سیف اللہ تھا ان کا وطن بھی اورنگ آباد تھا۔ عربی اور فارسی زبانوں کے عالم تھے۔ ذیل میں دونوں کے کلام کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

رشتۂ خوب اس کو دیا حق نے ہمیں بخت سیاہ | اُس طرف صبح وطن شام غریباں اس طرف

(عروج)

آرسی کو مت دکھا مژگاں و ابرو ہمدگر | خنجر و شمشیر شیشہ میں لڑاتا ہے کوئی

(انور)

تمنا

یہ وہی شاعر اور مصنف ہیں جنھوں نے شعراء کا ایک تذکرہ "گل عجائب" لکھا ہے۔ ان کا نام اسد علی خاں اور تمنا تخلص تھا۔ وطن اورنگ آباد تھا مگر حیدر آباد میں مقیم رہتے تھے "صمصام الملک عبدالحی خاں اور ارسطو جاہ کے درباری شاعر تھے"[۳]۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

باغ جہاں میں یارب جبتک گل بقا ہو | گلشن ہو باغباں ہو غنچہ ہو اور صبا ہو

سبزے کی پرورش پر بارش کرے ترحم | گرمی ہو گرم جس جا واں بادکش ہوا ہو

۱؎ "گل عجائب" ص۱۵۔ ۲؎ گل عجائب ص۱۶ و ص۱۵۲ ۳؎ "دکن میں اردو" کے مصنف نے "پوچھے" کی بجائے "سمجھے" لکھا ہے۔ مگر گل عجائب کے مصنف نے "پوچھے" لکھا ہے۔

۳؎ دکن میں اردو ص۲۸۴

سنبل کا طرہ ہووے اور زینتِ خیاباں　　　جال زلف کا ہو حلقہ شانہ گرہ کشا ہو

تجلی و ایمان تجلی کا نام علی شاہ تھا، عربی و فارسی کے عالم تھے۔ "تزکِ آصفیہ" انھیں کی بلند پایہ تصنیف ہے ۱۲۱۵ھ میں فوت ہو گئے۔ ایمان کا نام شیر محمد خاں تھا، دربارِ آصفی میں وقائع نگاری کی خدمت پر مامور تھے۔ ارسطو جاہ کے رکنِ دربار تھے۔ تجلی کے شاگرد تھے۔ خود ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ذیل میں دونوں کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

اوس زلفِ مشکبار پہ جی تک کروں نثار　　　دلوے یہ بختِ تیرہ جو بہرِ نثار دست

(تجلی)

اس قدر سنگدلی تم کو نہیں ہے لازم　　　کسی مظلوم کی گر آہ ہے تو دل لیجئے گا

(ایمان)

فتوت ان کا نام خواجہ عنایت اللہ خاں تھا فتوت تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد خواجہ عبدالرحمن دربارِ آصفیہ کے خطاب یافتہ تھے اور امرا میں شمار ہوتے تھے۔ فتوت اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۹۸ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اردو گو شعرا کے ایک تذکرہ "ریاضِ حسنی" کے مصنف تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

جب سے مجھ دل پر پڑی ہے یار کی کاکل کی چھانہہ　　　خوش نہیں آتی ہے مت سی باغ میں سنبل کی چھانہہ

مرثیہ گو شعراء عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرثیہ گوئی ایران سے براہِ راست لکھنو اور دلی آئی* لکھنو اور دلی کے مرثیہ گو شعراء سے بہت پہلے جنوبی ہند میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہو چکا تھا چنانچہ اسی کتاب کے شروع میں محمد قلی قطب شاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ، احمد، مرزا، ہاشمی، ذوقی، اشرف اور شیخ احمد وغیرہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے ہر شاعر مرثیہ گو تھا بلکہ بعض نے تو صرف مرثیہ گوئی کی

* آئی۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ عہدِ دکن میں مرثیہ گوئی اس امر کا شاہد ہے کہ ... لکھنو

اور اس کو اپنی نجات کا ذریعہ تصور کیا۔ جیسے مرزا خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں مرثیہ گوئی کو بہت عروج حاصل ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب شاہی اور عادل شاہی یہ دونوں خاندان شیعہ تھے۔ ان خاندانوں کے سلاطین شہدائے کربلا کے ذکر کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ ان سلاطین میں سے جو خود شاعر تھے انھوں نے مرثیہ گوئی کر کے دوسرے شاعروں کے لئے بھی مثال قائم کر دی اور پھر اس دور کے شعرا نے عام طور مرثیہ گوئی شروع کر دی رفتہ رفتہ مرثیہ نے اردو شاعری میں مستقل صنف کی جگہ حاصل کر لی اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

خاندانِ آصفیہ کے فرماں رواؤں کا مذہب شیعہ نہ تھا مگر وہ بھی حضرت امام حسین اور آپ کے اہلِ بیت کے مصائب سے حد درجہ متاثر تھے پھر چونکہ خاندانِ آصفیہ سے بہت پہلے مرثیہ گوئی کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے آصفیہ عہد حکومت میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا خصوصاً وہ شاعر جن کا مذہب شیعہ تھا، بدستور ذکر مصائب میں مصروف رہے۔ عہد آصفیہ کے مرثیہ گو شعرا کی فہرست بہت طویل ہے مگر ولی، ارضی، قادر، روحی، ہاشم اور امامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ان کے مرثیوں کے نمونے درج کئے جاتے ہیں ان مرثیوں کی ۔۔۔ ادبی حیثیت وہ نہیں جو شمالی ہند کے مرثیہ نگاروں نے خاص طور سے پیش نظر رکھی اور جس میں وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے مگر ان مرثیوں میں جو سوز و گداز اور جذبات کی مصوری ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اور بعض مرثیوں کی برجستگی زبان کی سلاست اور روانی بھی قابلِ ذکر ہے۔ جیسے رضی کا مرثیہ۔ اسی طرح روحی کے مرثیے زبان کے علاوہ ادبی حیثیت سے بھی بہت اونچا مقام رکھتے ہیں

مرثیہ ولی اورنگ آبادی

اے ہادیٔ ہنسار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا

اے نور چشم مصطفیٰ فرزند نوشاہ مرتضیٰ
اے دلبر خیر النساء تو کیوں جا بسایا کربلا

تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے
تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا

مرثیہ حافظ رضی الدین رضی

غم سوں ہے بے قرار میرا دل
دکھ سوں ہے زار زار میرا دل

گلشن غم میں ہے شہیداں کے
لالۂ و عذار میرا دل

نیم بسمل نمن تڑپتا ہے
ہو گئے غم کا شکار میرا دل

مرثیہ میر عبدالقادر قادر حیدرآبادی

حسینؓ و حسنؓ پر ہے دائم درود
نبی کے نین پر ہے دائم درود

علیؓ کے رتن پر ہے دائم درود
کہو پنجتن پر ہے دائم درود

حسینا کرم کر تو قادر اوپر
ترے پیراہن پر ہے دائم درود

مرثیہ روحی

آج غمناک ہیں حسین کے گل
بلکہ دل چاک ہیں حسن کے گل

غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں
نرگس و لالہ یاسمن کے گل

جب سنے شہ کی بات مجلس ہیں
جل بجھے شمع انجمن کے گل

مرثیہ ہاشم علی برہان پوری

جاؤں کدھر میں کیا کروں، یہ گود خالی لے پھروں
پھر اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
یہ دیکھ میرا حال توں توڑی ہوں سر کے بال کوں
میں دل کی حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
تھے کھیلنے کے دن ترے کیا عمر کیا تھی سن تری
نہیں چین مجکو بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا

مرثیہ امامی

کیا ظالماں نے ظلم کیا بے حساب آج
مظلوم کربلا میں ہیں عالی جناب آج
اس غم سوں مومناں کوں ہوا پیچ و تاب آج
گویا علی کے گھر کا کھولا غم کا باب آج
مینا سے قد کوں شہ کے شکستہ کیا دیکھو
سنگین دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج

عہدِ آصفیہ کی اُردو پر تبصرہ

عہدِ آصفیہ کی اُردو کے نمونے، شعراء کی کثرت اور فرماں روایانِ ریاست کی سرپرستی کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ مسئلہ بحث طلب نہیں رہتا ہے کہ کیا واقعی اس دور میں اُردو نے غیر معمولی ترقی کی؟ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف زبان و ادب کو بلکہ فن کے کسی شعبہ کو اگر مخلص سرپرست میسر آجائیں تو وہ بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ جنوبی ہند میں اُردو کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا۔

لہ یہ تمام مراثی "یورپ" میں دکھنی مخطوطات میں سے نقل کئے گئے ہیں۔

ابتداء میں یہ صوفیاء اور اکابرین مذہب کی گود میں پلتی رہی پھر بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کی منظورِ نظر بنی رہی، مغلیہ عہد میں بھی دکن کے صوبیداروں اور خود مغل بادشاہوں نے اس کی ناز برداری کی، سلطنتِ خداداد میسور کے دونوں فرماں رواؤں کے زمانے میں بھی اسے قربِ سلطانی حاصل رہا اور اس کے بعد زمانۂ زیرِ بحث یعنی عہدِ آصفیہ کے ابتدائی دور میں بھی خاندانِ آصفیہ کے حکمرانوں نے اس کی سرپرستی کی یہی وجہ ہے کہ صدہا انقلابات آئے۔ ملک کو شکست و ریخت کے حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر نہالِ اُردو ہر طوفان کا مقابلہ کرتا رہا۔ اُس کی جڑیں روز بروز گہری ہوتی گئیں اور وہ تناور درخت بنتا گیا۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ آصفیہ دور اس کے حق میں بارانِ رحمت ثابت ہوا۔ ان نوابوں کی علم دوستی اور شعراء نوازی نے بہت سے اہلِ قلم کو ابھرنے کا موقع دیا اور ولی کے بعد شعراء اورنگ آباد کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے شعر و ادب کی خدمت اور زبانِ اُردو کی ترویج و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور سراج، عزلت، رضی، روحی اور ہاشم علی جیسے باکمال اہلِ قلم نے اُردو شاعری میں گراں بہا اضافے کئے۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ غزل کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی گئی۔ غزل میں تصوف کے ساتھ ساتھ عشقِ مجازی سے تعلق رکھنے والے مضامین بھی نظم کئے گئے۔ رنگینی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی آبگینۂ شعر میں گرمی پیدا کرتے رہے۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہوتی گئی۔ غزل کے علاوہ قصیدہ اور مرثیہ کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ دکھنی زبانوں کے الفاظ متروک ہوتے گئے اور اُن کی جگہ عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہوتے گئے۔

عہدِ آصفیہ میں اُردو کا

ڈیڑھ سو سالہ دور

دکن میں اردو کا یہ ڈیڑھ سو سالہ دور سنہ ۱۲۲۰ھ سے شروع ہو کر تا دمِ تحریر (سنہ ۱۳۷۶ھ) شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں جہاں حیدرآباد کی مسندِ حکومت پر نواب سکندر جاہ اور نواب ناصر الدولہ جیسے علم دوست اور ادب پرور فرماں روا متمکن ہوئے وہاں میر محبوب علی خاں اور عثمان علی خاں جیسے حکمراں بھی آئے جو نہ صرف علم و ادب کے سرپرست تھے بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ اسے بھی اُردو کی خوش بختی سمجھیے کہ حیدرآباد کو دو ایسے وزیر اعظم ملے جو ادب نواز ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے یعنی مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ اور یمین السلطنت سری کشن پرشاد شادؔ۔ ان لوگوں کی توجہ اور شعر و سخن سے شیفتگی کا نتیجہ ہے کہ عہدِ آصفیہ کا یہ دور گذشتہ تمام ادوار سے بازی لے گیا۔ اس دور میں حیدرآباد میں ایک سے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے۔ جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ ذیل میں ان کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ ان میں سے چند اور قابلِ ذکر لوگوں کے حالات اور نمونۂ کلام کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جائے۔

۱؎ عثمان علی خاں گو اب بھی نظامِ حیدرآباد ہیں مگر اب اُن کی حیثیت ختم ہو چکی ہے صرف نام ہی نام ہے۔ (پیام)

شاداں، ایما، احسان، قیس، سحر، چندا، کافی، سخن، سجاد، شرر، ہمت، جولاں، واقف، محکم، ظہور، آفاق، لائق، قربان، فیض، خاموش، ربط، تمیز، مکھن، ہوش، عصر، اقبال، باقی، پاس، جوش، رنج، شعلہ، شائق، فیاض، مائل، وزیر، امجد، امیر، آزاد، بازغ، توفیق، تجلی، علم، ولی، ذہن، شاد، عزیز، لمعہ، کیفی، محب، اختر، نظر، لطف، شہرت، صغیر، صفی، بسمل، ساقی، شہید، باز، جذب، درد، رسا، سعید، مسرور، علم، باقی، بدر، ذکی، اشک، رشید، شمیم، زیبا، وجد، مخدوم، شاعر، میکش، شاد، تمکنت اور نگاہ وغیرہم۔

اب ذیل میں ان میں سے چند قابل ذکر لوگوں کے حالات اور نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

شاداں

ان کا نام مہاراجہ چندو لال اور تخلص شاداں تھا۔ سنہ ۱۱۸۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا تعلقداری سے ہوئی اور ترقی کرتے کرتے پیشکار سلطنت آصفیہ اور دیوان کے عہدے تک پہونچ گئے۔ شعر و سخن سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ خود بہت اچھے شاعر تھے شاعروں کے بہت بڑے سرپرست بھی تھے۔ انہیں کی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ اس دور کا حیدرآباد شعرا و ادباء کا ملجا و ماوا ہو رہا تھا۔ شاداں اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ بہت نیک دل اور صوفی منش آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام پر بھی تصوف کا رنگ غالب ہے۔ سنہ ۱۲۶۱ھ میں شاداں کا انتقال ہوگیا۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے کم از کم ان کی قادر الکلامی کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے

دل کو سمجھ رہا ہوں میں دلدار کی متاع ۔۔۔ اپنی جو ہے متاع وہ ہے یار کی متاع
دل کو جب تک نہ کچھ علاقہ ہو ۔۔۔ کوئی لکھتا ہے بے سبب کاغذ
موحد ہے تو یکتائی سے مت ٹل ۔۔۔ رکھ اپنی زباں سے دوسرا ہے

ایما ایما کا نام حسین علی خاں تھا۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور یہاں کے شرفا میں شمار ہوتے تھے مہاراجہ چندو لال کی قدردانی کا حال سن کر اورنگ آباد سے حیدرآباد چلے آئے۔ یہاں مہاراجہ نے اُن کی بہت عزت کی۔ اپنی مصاحبت میں لے لیا اور پانچ سو روپیہ تنخواہ مقرر کردی۔ ایما اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور صاحبِ دیوان بھی تھے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں انتقال ہوا ذیل میں اُن کی وہ تضمین درج کی جاتی ہے جس پر نواب سکندر جاہ بہادر نے انہیں پانچ سو روپیہ انعام دیا تھا۔ "تذکرہ شعرائے اورنگ آباد"[1] کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک وقت نواب سکندر جاہ بہادر نے ایما کو یہ فرد دی کہ اس کو اُردو میں تضمین کیا جائے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ایما نے حسب ذیل تضمین پیش کی اور پانچ سو روپے صلہ پایا۔

ایما! میں ساکنانِ چمن سے کیا سوال — ہم بھی تو تھے خزاں میں تمہارے شریک درد
کیفیتیں بہار کی ہم سے بھی کچھ کہو — اور ی بہشت دے کی ہوئی کس طرح نبرد
غنچہ جو مسکرا کے دیا چٹ سے میں جواب — تو نے سنی نہیں کسی اُستاد کی یہ فرد

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

قلیس یہ بھی مہاراجہ چندو لال کے درباری شاعر تھے۔ محمد صدیق نام تھا۔ وقائع نگاری کے منصب پر فائز تھے۔ قصائد کے میدان میں خوب خوب جولانیاں دکھاتے تھے۔ ریختی بھی لکھی ہے مزاج میں بہت رنگینی اور شوخی تھی اس لیے مضامین بھی بہت رنگین نظم کرتے تھے جو بعض وقت ابتذال کی حد تک پہونچ جاتے

---

[1] تذکرہ شعرائے اُردو اورنگ آباد مؤلفہ محمد سردار علی صاحب

تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلام میں لطافت اور نفاست بھی ہے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں فوت ہوئے۔ ذیل میں ان کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

ترے عارض کے اگر سامنے آجائے سحر — عکس پیدا کرے آئینۂ تصویر میں گل
نکالیں گے ہم اپنی حسرتِ دل — جو بات آئی کسو دن رات کو ہم

سحر ان کا نام محمد خلیل خاں تھا۔ سحر تخلص کرتے تھے۔ دو ہزاری کے منصب پر سرفراز تھے۔ خطابات سے بھی نواز ے گئے تھے۔ قصائد میں پایہ بلند تھا۔ ذیل میں اُن کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

یارب مرے اس کا یوں بہ مجھے بوس و کنارِ دست — لب لب سے[1] ابر سے برسے گلہائے بہار دست
نشہ میں اب کی کرے گا سیرِ بہارِ دوست — دیکھ بدست لالۂ رُخ مشکبار دست

آگاہی ان کا نام میر عباس علی خاں تھا۔ جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عربی فارسی اور ہندی زبانوں کے عالم تھے۔ مہاراجہ چندو لال کے مصاحب تھے۔ سنہ ۱۲۳۷ھ میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

لگادی سوزشِ داغِ جگر نے آگ سب تن میں — ہوا آخر یہ شعلہ برقِ سوزاں اپنے خرمن میں
جیوں سے کیوں نہ ہو ربطِ قدیمی مجھکو اے ناصح — کہ آغوشِ پری گہوارہ تھا میر الڑکپن میں

سخن ان کا نام میر غلام مصطفےٰ تھا۔ سنہ ۱۱۸۷ھ میں پیدا ہوئے۔ لالہ لچھمی نرائن شفیق کے شاگرد تھے۔ غزل کے علاوہ قصیدے اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نمونۂ کلام درجِ ذیل ہے۔

محذور ہمیں اب رکھے گا، آجائے جو منہ پر رازِ درِ دل
اک جام پلا کر ساقی نے سرشارِ مئے اسرار کیا

---

[1] یہ مصرعہ درست نہیں معلوم ہوتا ہے مگر "دکن میں اُردو" کے مصنف نے اسی طرح درج کیا ہے۔

کس کی زلفوں نے دل کو پیچ دیا — پیچ اس پیچ و تاب کا نہ کھلا

جولاںؔ جولاںؔ کا نام میر حسن علی خاں تھا۔ وطن حیدرآباد تھا۔ سنہ ۱۲۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ غزل کے علاوہ قصائد بھی لکھے ہیں۔ جولاںؔ اپنے عہد کے اچھے شاعروں میں سے تھے۔ ان کے ایک قصیدے کا نمونہ درج ذیل ہے۔

ہے زبس نیرنگیٔ دوراں سے دل زار و نزار — شیشۂ ساعت سا نت رہتا ہے خاطر پُرغبار
دور ہیں اس وضع بد کے ایک دم فرصت نہیں — در پے ایذائے مردم ہے زبس لیل و نہار
سیر کرتے ہی ہیں پھرتا تھا چمن میں ناگہاں — کہہ دیا دل سے مرے اک بار مجھ کو یہ پکار
لیکے خامہ کی تئیں لکھ وصف ایسے شخص کی — تا کہ جلدی سے تیری ہوویں سب ہی اجرائے کار
بات سنتے ہی میں نے اوس گھڑی مطلع لکھا — تب کئے سب نے پسند اوس کو جو کوئی تھا ہوشیار
معدنِ جود و سخا و مخزنِ تدبیر کار — زور بازوئے شجاعت، سیف ملک نامدار

لائقؔ ان کا نام بدرالدین خاں تھا۔ موروثی جاگیردار تھے۔ دربارِ آصفیہ سے وابستہ تھے۔ امیر جنگ امیرالدولہ خطاب پایا تھا۔ اپنے بلند اخلاق اور نفاست مزاج کے لئے بہت مشہور تھے۔ شعر و سخن کا نہ صرف ذوق تھا بلکہ اس میں خاصہ کمال حاصل کیا تھا۔ سنہ ۱۲۶۶ھ میں فوت ہوئے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے

تابشِ خورشید تاباں سے ہوا گر سنگ لعل — گرمیٔ داغِ جگر نے دل شرر کا خون کیا
الفتِ صیاد سے کہتا ہے ہر مرغ اسیر — گو قفس ٹوٹے پر ہم پرواز کر سکتے نہیں

فیضؔ فیضؔ کا نام میر شمس الدین ہے۔ ان کے والد کا وطن دہلی تھا۔ آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں نقل مکانی کرکے دکن آگئے تھے یہیں سنہ ۱۱۹۵ھ میں (برار میں) فیضؔ پیدا ہوئے سنِ شعور میں قدم رکھنے کے بعد اپنے وقت کے مروجہ علوم کا مطالعہ کیا اور ان میں ایسا کمال حاصل کیا کہ صاحبِ تصنیف ہوگئے دربارِ حیدرآباد کی طرف سے بھی بہت قدر افزائی کی گئی اور منصب و جاگیر سے نوازا گیا

فیض اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے۔ حلقۂ تلامذہ بھی بہت وسیع تھا۔ خواجہ میر درد کے شاگرد و مشتاق دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ زبان بہت صاف، خیالات ارفع و اعلیٰ اور بہت نازک تھے۔ مزاج پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے کہیں کہیں کلام میں بھی اس کے اثرات ملتے ہیں۔ ۱۲۵۴ھ میں فیض کا انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے — مگر نہ قبضے میں دامانِ آرزو آیا
عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمتِ مرگ — بہت راتوں جگا تھا سو رہا ہوں

خاموش ان کا نام شاہ معین الدین تھا۔ وطن بیدر۔ حضرت خواجہ گیسودراز کی اولاد میں سے تھے۔ ناصر الدولہ کے عہدِ حکومت میں بیدر سے حیدرآباد آئے اور پھر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ بہت عابد و زاہد اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ۱۲۸۷ھ میں فوت ہو گئے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

چھپے کرتی ہے کیا، اس سے نہیں کچھ حاصل — مثلِ پروانہ پروبال جلا لے بلبل
کفر کافر کو بھلا، شیخ کو اسلام بھلا — عاشقاں آپ بھلے، اپنا دل آرام بھلا

ربط ان کا نام بالا پرشاد تھا۔ ربط تخلص کرتے تھے۔ آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ دربارِ آصفیہ سے وابستہ تھے۔ اپنے دور کے باکمال اور مشہور شاعر تھے۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

تاب و تواں و صبر گئے دل کے ساتھ ساتھ — محفل اُٹھی ہے صاحبِ محفل کے ساتھ ساتھ
سر سے کفن لپیٹے ہوئے پھر رہے ہیں ربط — مرنے کے اشتیاق میں قاتل کے ساتھ ساتھ

آصف آصف حیدرآباد کے گذشتہ فرماں روا میر محبوب علی خاں کا تخلص تھا۔ داغ کے شاگرد تھے۔ حیدرآباد کے تختِ سلطنت پر ان جیسا علم دوست اور شعرا و ادبا کا سرپرست شاید ہی کوئی متمکن ہوا ہو۔ ان کے دورِ حکومت میں

ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے اور شاید اس سے پہلے اہلِ کمال کا اتنا بڑا مجمع یہاں نہیں ہوا تھا۔ داغ، امیر، سرشار، شرر، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، مولانا سید علی بلگرامی، نواب سید حسین بلگرامی، علامہ شبلی، مولوی عزیز مرزا وغیرہم کا اجتماع اسی دور کی یادگار ہے۔ اور نواب محبوب علی خاں کی علم دوستی اور ادب نوازی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ خود میر محبوب علی خاں کا مذاق شعر بہت پاکیزہ اور ستھرا تھا۔ عاشقانہ غزلوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ زبان اور اندازِ بیان دونوں بہت صاف رواں اور سلیس ہیں۔ بے ساختگی اور بے تکلفی ان کے کلام کی نمایاں خوبی ہے۔ کہیں کہیں شوخی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام مندرج ذیل ہے۔

لو اور سنو، کہتے ہیں وہ دیکھ کے مجھ کو — یہ شخص بلا شبہ ہے دیوانہ کسی کا
ان حیلوں سے کوئی خون کا دعویٰ نہ کرے — خوں بہا دیتے نہیں، خون بہا دیتے ہیں
پانی بہا سکے نہ زمیں جذب کر سکے — قاتل چھپے گا نہ خون مجھ بے گناہ کا

باقی ان کا نام گردھاری پرشاد تھا۔ باقی تخلص کرتے تھے۔ متوسلینِ حیدرآباد میں سے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ بہت پُرگو اور اس کے ساتھ ساتھ خوش گو شاعر تھے۔ خیالات میں جدت تھی۔ غزل کے علاوہ مثنوی اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔ کثیر التصانیف آدمی تھے۔ ۱۳۱۴ھ میں فوت ہو گئے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے — حقِ ہمسایہ ادا کرتا ہوں
میں وہ دیوانہ ہوں کعبے میں جو آتا مرے ہاتھ — تار بھی باقی نہ رکھتا جامۂ احرام کا
کیا قدر تمہاری کوئی باقی کرے افسوس — تم اچھے ہو لیکن یہ زمانہ نہیں اچھا

شعلہ ان کا نام میر کاظم علی خاں تھا۔ شعلہ تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۵۲ھ میں حیدرآباد

میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ کی عنایت سے امیر الشعراء کا خطاب ملا۔ ۱۳۰۸؁ھ میں فوت ہو گئے۔

شعلہ ان چند حیدر آبادی شعراء میں سے ایک تھے جو حیدر آبادی ہونیکے باوجود حیدر آبادی نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہے اور شاعرانہ وقیق لوازمات سے بھی مملو ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

سنتے کہ نہ سنتے وہ، کہنا تھا ہمیں لازم   آتے کہ نہ آتے وہ، شکوہ تو کیا ہوتا
سنگدل میرے گل اندام کو کہتے ہیں جو لوگ   ان کے ہو جائیں زباں در دہن پتھر کے

فیاض ان کا نام محمد فیاض الدین تھا۔ دربار آصفیہ کے امراء میں سے تھے۔ حیدر آباد کے مشہور اور باکمال شاعر تھے۔ شاگردوں کی تعداد بھی کثیر تھی۔ ۱۳۲۶؁ھ میں فوت ہوئے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

ہوتا ہے بیکسی میں کہاں کوئی آشنا   بیگانہ منحرف ہے سبزہ بھی، اپنے مزار کا

مائلؔ ان کا نام (ڈاکٹر) احمد حسین خاں تھا۔ مائلؔ تخلص کرتے تھے۔ نہ صرف حیدرآباد کے بلکہ ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں شامل کرنے کے قابل تھے اپنے زمانے ہی میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ زبان بہت سلیس، خیالات بلند ہونے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ اور اندازِ بیان میں کسی قدر تیکھا پن تھا۔ ۱۳۳۲؁ھ میں فوت ہو گئے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

وہ عنایت وہ مروت وہ محبت نہ رہی   آپ آتے بھی نہیں ہم کو بلاتے بھی نہیں
میرے سینے میں رہے، سب کی نگاہوں میں پھرے   دل سے جاتے بھی نہیں دل میں سماتے بھی نہیں

امجدؔ حیدر آباد کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ بلکہ صرف حیدر آباد ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ احمد حسین نام

امجد امجد تخلص ہے۔ ۱۳۰۲ھ میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے۔ مدرسۂ نظامیہ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے بھی سند یافتہ ہیں۔ یعنی منشی فاضل کا امتحان اسی یونیورسٹی سے پاس کیا۔ کچھ عرصے تک سلسلہ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ مگر پھر حیدرآباد کے صدر دفتر (شعبۂ محاسب) میں چلے گئے۔ امجد کی شاعری میں دریائے موسیٰ کی طغیانی (۱۳۲۶ھ) کا بہت کافی دخل ہے۔ اس طغیانی میں جہاں اور بہت سے خاندان غرقاب ہوئے وہاں امجد کی والدہ، بیوی اور صاحبزادی بھی لقمۂ اجل ہوگئیں۔ اس صدمۂ جانکاہ نے امجد کی شاعرانہ حس کو بیدار کردیا اور اُن کے سازِ احساس کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے۔

اُنہوں نے اپنے رہوارِ فکر کے لئے نظم، غزل اور رباعیات کے میدانوں کو منتخب کیا اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ ان میں سے رباعی کا میدان انہیں کے ہاتھ رہا۔ موجودہ شعراء میں جوشؔ ملیح آبادی اور امجد حیدرآبادی ہی دو مقتدر ہستیاں ہیں جنہوں نے صنف رباعی کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی بیشتر صلاحیتیں صرف کردیں۔ بلکہ خونِ جگر کی آمیزش سے اس صنف کو پروان چڑھایا۔ امجد کی رباعیاں مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے حامل ہوتی ہیں۔ سادگی، درد و تاثر اور دلکشی اُن کی عام شاعری کی طرح اُن کی رباعیوں میں بھی پائی جاتی ہے امجد کی نظمیں دیکھ کر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ حیدرآبادی شعراء میں امجد وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے عشقیہ مضامین سے ہٹ کر حالات و واقعات، تمدن و معاشرت اور انسانیت سے تعلق رکھنے والے مسائل بیان کرکے نظم کے دامن کو وسعت دی۔ "ماں اور بچی"، "دعائے یتیم"، "یادِ شوہر"، "ایک بیکس کا خواب" اور "مکالمۂ جان و تن"۔ امجد کی وہ نظمیں ہیں جو متذکرہ بالا خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔ امجد نے غزل میں گو کسی ایجاد و اختراع کا ثبوت نہیں دیا مگر اس سے

انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی غزلیں زبان کی سادگی، خیالات کی نزاکت اور سوز و گداز کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ اُن کے یہاں فلسفہ اور تصوف کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔ ذیل میں اُن کا نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے۔

رُباعی

اس سینہ میں، کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

آزاد — آزاد کا نام محمد حسین ہے۔ ۱۲۹۷ھ میں پیدا ہوئے۔ مدرسۂ دارالعلوم کے فاضل ہونے کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل بھی ہیں۔ عرصہ تک سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ کلام کا رنگ ظریفانہ ہے۔ معاشرے پر مزاح کے نشتر چلاتے ہیں۔ امجد حیدرآبادی نے اُن کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے معاشرے کی بے راہ روی کو تنقید کا نشانہ بنا کر قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ مگر انہیں اکبر الہ آبادی کی صف میں کھڑا کرنا درست نہیں ہے۔ آزاد کو اکبر کے طرزِ سخن سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اکبر بہت اونچے درجے کا شاعر تھا اُس نے طنز اور مزاح کے امتزاج سے ایسی لطیف اور بھرپور کیفیت پیدا کردی تھی کہ مقابل کے لئے کہیں جائے فرار باقی نہیں رہتی تھی آزاد کی شاعری کا مطالعہ کر کے اُن کے کمالِ فن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میدان میں اکبر کے بعد انہیں کا نام آتا ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

یہاں سے ہم اپنی گاڑی بچا کر کیسے لے جائیں   جدھر دیکھو ادھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا

لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت　　لگا دو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا

باذغ ان کا نام محمد عبدالحی تھا۔ ضیاء گورگانی کے شاگرد تھے۔ حیدرآباد کے محکمۂ مال گذاری میں ملازم تھے۔ حیدرآباد کے باکمال شعراء میں سے تھے۔ مذاق نہایت پاکیزہ اور ستھرا تھا۔ غزل کے عام مضامین کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کو بھی موضوع شاعری بناتے تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

کسی اُستاد نے کیا بات یہ اچھی بتائی ہے　　بھلائی میں بُرائی ہے بُرائی میں بھلائی ہے
زمانے کا نہ دیں گر ساتھ تو دشوار ہے جینا　　روابط اہل دُنیا سے نہ رکھیں تو بُرائی ہے[1]

توفیق ان کا نام سید جلال الدین تھا۔ حیدرآباد کے رہنے والے تھے ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے۔ صرف و نحو، طب عروض و معانی اور خوشنویسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ صاحب دیوان تھے ۱۲ ذوالحجہ ۱۳۳۹ھ کو انتقال ہوا۔ توفیق اُن چند شعراء میں سے تھے۔ جن پر حیدرآباد ہمیشہ فخر کرے گا۔ اُنہوں نے غزل اور رُباعی انہیں دو اصناف سخن میں زیادہ طبع آزمائی کی جن میں سے اوّل الذکر صنف میں قابل ذکر حد تک ترقی کی۔ توفیق کی غزلوں میں میر درد کا سا انداز ملتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بیان کی شوخی بھی ہے تصوف اور فلسفہ بھی ہے مگر بے جان اور تقلیدی نہیں ذیل میں اُن کا نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے۔

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا، کبھی ہوں میں پردۂ راز میں
کہ حقیقت اک ہی مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں

کون سوتے ہوئے فتنے کو جگائے توفیق　　کون پوچھے کہ رہے رات کو سرکار کہاں
ایک دل ہے مرے پہلو میں سو وہ بھی صد چاک　　لائقِ نذر نہیں، قابلِ سوغات نہیں

---

[1] سخنورانِ دکن صـ ۱۱۶

تجلی ان کا نام سید منتخب الدین تھا۔ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا بخارا سے ترک وطن کرکے ہندوستان آئے اور دکن میں مقیم ہوئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے اورنگ آباد کی صوبیداری تک پہونچ گئے۔ تجلی کے والد نواب سیادت علی خاں بہادر بھی ناظم دیوانی بلدہ کے منصب جلیلہ پر فائز تھے۔ تجلی ربیع الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے۔ مدرسہ دارالعلوم اور مدرسہ دینیہ میں تعلیم حاصل کی اور ادب، صرف و نحو، حدیث، تفسیر، منطق اور فقہ میں کامل دستگاہ پیدا کرلی۔ محکمۂ مال کی مختلف آسامیوں پر کام کیا۔ اور آخر میں ضلع رائچور کے صدر خزانہ دار ہو گئے۔ ۱۶ راگست ۱۹۲۷ء کو تجلی کا انتقال ہوگیا۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ ابتدا میں مقامی اساتذہ مثلاً، آغا شوشتری، ترکی اور ضیا گورگانی وغیرہ سے اصلاح لی اور پھر داغ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ تجلی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو شاعری میں اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے غزل، قصیدہ۔ اور نعت میں خاص طور سے طبع آزمائی کی اور ان تینوں اصناف میں اپنے لئے خاص مقام حاصل کرلیا۔ اُن کی غزلوں میں جذبات کی رنگینی اور طرزِ ادا کی بیباکی و بیساختگی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اُن کی زبان بہت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ خیالات کچھ زیادہ ارفع و اعلیٰ نہیں مگر طرزِ ادا کی حلاوت ان میں دلکشی پیدا کردیتی ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

کچھ تو تجلی کے عشق میں دیکھا جو کھوئے ہوش ‍ ‍ ‍ ‍ دیوانہ ہیں نہیں بھلا تھا ہوشیار ہوں
اس شوخ مزاجی پہ شریروں کی ہے صحبت ‍ ‍ ‍ ‍ کیا جانیے لائیگی طبیعت تری کیا رنگ

حلم ان کا نام محمد جمال الدین تھا۔ امرائے حیدرآباد میں سے تھے۔ مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی۔ عرصے تک نظام حیدرآباد کے اے، ڈی، سی رہے

۱۳۴۶ھ میں انتقال کر گئے۔ حلم کا مقام ہندی شاعری میں بہت بلند ہے۔ انہوں نے بھاشا زبان میں بہت سی ٹھمریاں لکھی ہیں جو زبان کے اعتبار سے بہت شستہ اور جذبات کے اعتبار سے بھرپور ہیں۔ اُن کی حلاوت خاص طور سے قابل لحاظ ہے۔ اُن کی ٹھمریوں کا مجموعہ "پیت کی ریت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ حلم کی غزلیں بھی زبان کی نفاست اندازِ بیان کی برجستگی اور خیالات کی رنگینی کے اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ ذیل میں ان کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

کہتے ہو کہ داغِ دلِ سوزاں نہیں دیکھا　　کیا تم نے چراغِ تہہ داماں نہیں دیکھا؟
جب پاؤں بڑھے دامنِ صحرا ہوا ریزے　　جب ہاتھ اُٹھے اپنا گریباں نہیں دیکھا

ٹھمری دھناسری

دور نہیں ہوں پاس سب کے　　میرے کو کوئی ڈھونڈو تو
پھیرو جدھر مکھ سامنے ہوں میں　　کھول کے آنکھیں دیکھو تو
حلم نہیں میں اور ہی کچھ ہوں　　جانو بوجھو سوچو تو

دل دل بھی حیدر آباد کے اچھے شاعروں میں سے تھے۔ محمد حیدر خاں نام تھا۔ اشرف الحکما لقمان الدولہ فلاطون جنگ خطاب ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا اور اس فن میں بہت مہارت اور شہرت حاصل کی۔ ۱۳۴۰ھ میں فوت ہو گئے۔ دل کو شعر و شاعری سے بہت شغف تھا۔ داغ کے شاگرد تھے۔ کلام میں بہت شیرینی تھی۔ تصوف کا رنگ بھی غالب تھا۔ کہیں کہیں ہلکی ہلکی کسک بھی محسوس ہوتی ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

دل سے وصلِ جاناں کی آرزو نہیں جاتی　　خاک ہو گئے لیکن جستجو نہیں جاتی
مثلِ نقش پا برباد اپنا کیوں نشاں ہوتا　　ہم نہ خاک میں ملتے تو جو مہرباں ہوتا

ذہین ان کا نام غلام مصطفےٰ تھا۔ دارالعلوم کے سند یافتہ تھے۔ ریاست کے محکمۂ صدر محاسب میں ملازم تھے۔ ۱۳۴۹ھ میں فوت ہوئے۔ ذہین کی خصوصیات شاعری میں سے سب سے اہم خصوصیت یہ ہے۔ کہ انہوں نے بچوں کے لئے نصیحت آمیز نظمیں لکھ کر شاعری کی اس صنف کی بیش بہا خدمت کی۔ بہت قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری سراسر فکری شاعری ہے خیالات نہایت بلند ہیں۔ طرزِ ادا میں بہت روانی ہے۔ بہت سی انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جن میں سے بعض نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

معیارِ حقیقت

پتھر سمجھئے دل میں جو مہر و وفا نہ ہو — مٹی کے ڈھیلے آنکھیں ہیں جن میں حیا نہ ہو
وہ کیا صبا کہ جس سے گرہ دل کی وا نہ ہو — وہ کیا نسیم چل کے اگر جاں فزا نہ ہو
وہ کیا مرض جو حد سے بڑھے اور شفا نہ ہو — وہ درد کب ہے درد جو بڑھ کر دوا نہ ہو
وہ پھول کیا کہ رنگ ہو، بوئے وفا نہ ہو — بلبل وہ کیا جو شاہدِ گل پہ فدا نہ ہو

شاد حیدرآباد کی علمی و ادبی ترقی میں شاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور حیدرآباد کی تاریخ ادب لکھتے وقت اُن کا نام کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُن کے ذکر کے بغیر یہ تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ شاد کا نام کشن پرشاد تھا۔ یمین السلطنت بہادر، کے سی، ایس، آئی خطابات تھے۔ حیدرآباد کی مشہور شخصیت مہاراجہ چندولال کے پوتے اور راجہ ہری کشن بہادر کے بیٹے تھے۔ ۱۸ جمادی الآخر ۱۲۸۰ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، انگریزی، مرہٹی اور تلنگی زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ ان میں سے

دو موٴخرالذکر زبانیں بطورِ خود سیکھیں۔ عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت اور انگریزی کے ماہر تھے۔ ان میں سے اُردو، فارسی اور سنسکرت میں شعر کہتے تھے۔ اس کے علاوہ فنِ خطاطی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ نہایت اچھے مصور بھی تھے۔ نظام کی پیش کاری سے ترقی کرتے کرتے وزارتِ عظمیٰ اور پھر صدرِ اعظم بابِ حکومت کے عہدۂ جلیلہ تک پہونچے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں نائٹ ہڈ کے سی، آئی، ای اور جی اسی، آئی، ای کے خطابات و اعزاز دیئے۔

شاؔد بہت علم دوست اور ادب نواز بزرگ تھے۔ شعرا و ادبا کے بہت بڑے قدردان اور سرپرست تھے۔

اُن کا دربار اُس دور کے باکمال شعراء امیؔر، داغؔ، جلالؔ اور ظہیؔر وغیرہ سے بھرا رہتا تھا۔ بہت سے شعراء اُن کے خوانِ نعمت سے فیض یاب ہوتے تھے۔ نہایت درجہ منکسر المزاج، خوش اخلاق اور شرافت کا مجسمہ تھے۔ قریب قریب پچاس کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں ناول، افسانہ، تاریخ، سفرنامے، عروض قافیہ اور شعر سے متعلق مختلف اصنافِ نظم و نثر شامل ہیں۔ مزاج پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے شاعری میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ بلکہ ان کی شاعری اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شیریں تھی۔ خیالات بہت پاکیزہ اور نازک تھے۔ عاشقانہ مضامین کے ساتھ ساتھ اخلاقی نکات بھی بیان کرتے تھے۔ داغؔ کے اثر سے کہیں کہیں کلام میں رنگینی بھی آجاتی تھی بہت پُرگو شاعر تھے۔ نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے۔

فنا کہتے ہیں کس کو؟ موت سے پہلے ہی مرجانا
بقا ہے نام کس کا؟ اپنی ہستی سے گذرجانا

نیرنگیِ انداز نظر دیکھ رہا ہوں — ڈوبی ہوئی ہے شوخ نظر شرم و حیا میں

عزیز

عزیز حیدرآباد کے ان چند باکمالوں میں سے تھے۔ جنھیں یہ سرزمین بآسانی فراموش نہیں کرسکے گی۔ ان کا نام محمد عزیز الدین تھا۔ ۱۲۹۲ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد "عطیات صرفِ خاص" کے ناظم مقرر ہوئے۔ تعلقدار کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ عزیز یار جنگ بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ یورپ کا سفر بھی کیا۔ داغ کے شاگرد اور انہیں کے طرزِ سخن کے پیرو تھے بلکہ بعض جگہ تو اُن کے اور داغ کے کلام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُن کی غزل کے تیور بڑے تیکھے ہوتے تھے۔ ایک اعلیٰ درجے کے مشہور و معروف واسوخت کے مصنف تھے۔ نمونۂ کلام درج کیا جاتا ہے۔

"محبت تیری کیا، تیری وفا کیا" — ذرا پھر تو کہو تم نے کہا کیا
مٹ جائے دل سے لذتِ آزار جھوٹ جھوٹ — ٹل جائے سر سے ہجر کی آفت غلط غلط

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں دلی کے رہنے والے تھے۔ اس لئے انہیں اس تذکرے میں شامل نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر جب اُن کے والد نعمت اللہ خاں انہیں لیکر حیدرآباد آئے تو اُن کی عمر صرف پانچ سال کی تھی گویا اُن کی پرورش اور تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی اور یہی سرزمین اُن کا وطن قرار پائی۔ اس لئے انہیں اس تذکرے میں شامل کرلیا گیا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ الہ آباد کے گریجویٹ تھے۔ عرصے تک حیدرآباد میں ہیڈ ماسٹر رہے پھر مددگار ناظم تعلیمات و کمشنر امتحانات کے عہدے پر فائز رہے۔ عین جوانی میں مرض دق کا عارضہ لاحق ہوا۔ مگر اس مہلک مرض سے صحتیاب ہوگئے اور کچھ عرصہ کے بعد حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ میں فوت ہوگئے۔

عظمت اللہ خاں اردو شاعری میں ایک نئی تحریک کے محرک تھے۔ اور وہ بھی

اُردو نظم میں ہندی بحور و اوزان اور ان کے استعمال کی تحریک۔ اس تحریک میں خود انہیں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہندی بحور و اوزان میں لکھی ہوئی اُن کی نظمیں بےحد مقبول ہوئیں۔ عظمت اللہ خاں کی نظمیں اپنی حلاوت، نرمی اور لوچ کے اعتبار سے اُردو شاعری کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔ اُن کے یہاں بہت رسیلا پن اور گھلاوٹ ہے۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "سریلے بول" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو سوز و گداز بھی موجود ہے۔ عظمت اللہ خاں صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کے نثر نگار بھی تھے۔ اُن کے مزاحیہ مضامین تو حد درجہ دلچسپ ہوتے تھے۔ ذیل میں اُن کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

مجھے پریت کا یہاں کوئی پھل نہ ملا ۔۔۔ مری جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا ۔۔۔ مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی

نہ بھلے کی تھی، نہ برے کی تھی، مجھے کچھ یہاں کی خبر نہ تھی ۔۔۔ تمہیں عیش ہی کا جو دھیان تھا، تمہیں میری چاہ اگر نہ تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے ۔۔۔ نہیں لینے تھے نہیں یوں مرے
بہت اپنی چاہ جتا جتا، مرے دل کو موہ کے لے لیا ۔۔۔ مرے واسطے یہ بہشت تھی، تمہیں زندگی تھی یہ کھیل تھا
مرے حُسن کے لئے کیوں مرے

کیفی ان کا نام سید رضی الدین حسین تھا۔ ۱۲۹۷ھ میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے مدرسہ دارالعلوم اور پنجاب یونیورسٹی سے سند حاصل کی۔ (پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی)۔ دارالترجمہ میں مصحح کی حیثیت سے ملازم تھے۔ ۱۳۳۸ھ میں اجمیر میں فوت ہو گئے۔

کیفی کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ پہلے میکش تھانوی کے شاگرد ہوئے اور پھر داغ دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ عرصے تک پرانے

رنگ میں غزلیں لکھتے رہے مگر پھر قومی احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ اُنکی نظمیں بہت جوشیلی اور حیاتِ نو کی پیغامبر ہیں۔ انھوں نے نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی لکھیں اور اُن میں مذہبی و اخلاقی مسائل کو بہت سلیقے اور دلکش انداز سے بیان کیا۔ ان سطور کا راقم ابتدائے عمر سے ایک رباعی سُنا کرتا تھا اور ہمیشہ اس پر جھوم اُٹھتا تھا۔ اسے اُس کی بدقسمتی کہئے کہ مذہبی شاعری سے اسے ہمیشہ بُعد رہا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی نظمیں دل کشی سے خالی ہوتی ہیں۔ مگر مولانا حالی کی نعت اور بعض نعتیہ نظموں کے بعد جس رباعی نے اس کے جذبات میں تلاطم برپا کر دیا وہ یہ ہے۔

هر چند گناہوں سے کنارا نہ کیا ۔۔۔ پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر ۔۔۔ لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں جب شعرا کے مختلف تذکرے اور دواوین اُس کی نظر سے گذرے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اس رباعی کے مصنف کیفی ہیں۔

کیفی کی غزلیں بھی اُن کی نظموں اور رباعیوں کی طرح نہایت دلکش ہوتی ہیں طرزِ ادا کی برجستگی، زبان کی صفائی اور خیالات کی شوخی ان کی غزلوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

دیارِ اُلفت کے رہنے والوں کا کیا حال پوچھتے ہو ہم سے
کسی کو خانہ بدوش پایا کسی کو خانہ خراب پایا

یہ رعبِ حسن کا منشا کہ آنکھ ادھر نہ پڑے ۔۔۔ یہ شوخیوں کا تقاضا کہ دیکھنا ہوگا

محب و نظم و جلیل محب حسین محب، نظم طباطبائی اور جلیل مانکپوری کو بھی بعض تذکرہ نویسوں نے شعرائے حیدرآباد میں شامل کر لیا ہے مگر یہ تینوں بزرگ صوبۂ متحدہ کے رہنے والے تھے البتہ حیدرآباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس لئے

انھیں اس تذکرے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

ضامن سید محمد ضامن نام ضامن تخلص ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ کو بمقام کنتور پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنے والد محترم کے ہمراہ حیدرآباد آ گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سر رشتہ تعلیم اور دارالطبع سے منسلک رہے اور دارالطبع کے منتظم کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھنے والوں میں ضامن کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ صرف شاعر اور نثر نگار ہی نہیں ایک اچھے اخبار نویس کی حیثیت سے بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے جن انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں ان ترجموں نے انھیں اعلیٰ درجے کے مترجمین کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اردو شاعری میں اگر ان کا مرتبہ بہت اونچا نہیں تو اپنے معاصرین سے پست بھی نہیں ہے۔ ان کی غزلیں بہت دلکش، بےساختگی اور جذبات نگاری کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ نمونہ کلام:۔

دل میں جو اک شگاف سا ہے — اس رخنے سے کوئی جھانکتا ہے
میں بھی مری وفا بھی جھوٹی — جو آپ کہیں وہی بجا ہے

عثمان نواب میر عثمان علی خاں بہادر والی حیدرآباد کا تخلص ہے۔ نواب صاحب ۲۹ جمادی الاول ۱۳۰۳ھ مطابق ۵ اپریل ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی انگریزی اور فنونِ جنگ کی تعلیم و تربیت اعلیٰ درجے کے ماہرین تعلیم سے حاصل کی ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو ستائیس سال کی عمر میں مسند آرائے حکومت ہوئے۔ ہر موقع پر حکومت برطانیہ کی معاونت کرتے ہوئے اپنے اجداد کی "شاندار" روایات کو قائم رکھا۔ اس معاونت کے طفیل ۱۹۱۸ء میں "وفادار سلطنت برطانیہ" کا خطاب ملا۔ سقوطِ حیدرآباد کا تاریخی اور افسوسناک واقعہ آپ ہی کے "عہدِ ہمایونی" میں پیش آیا اور آپ ہی نے ہندوستان کے ساتھ

ریاست کے الحاق کی دستاویز پر دستخط فرمائے۔ خیال ہے کہ آپ ہی کی ذاتِ بابرکات حیدرآباد کی آخری فرماں روا ثابت ہوگی۔ آج کل آپ ریاست کے حکمراں ضرور ہیں مگر برائے نام۔ اختیارات سے محروم۔

نواب صاحب موصوف شاعری بھی فرماتے ہیں عرصے تک مرحوم جلیل مانک پوری سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ آپ کا کلام "ملوک الکلام" کے ذیل میں شامل کیا جاتا ہے اور بطور تبرک پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کی شاعری میں کوئی خاص اور قابل ذکر خصوصیت نہیں ہے۔ البتہ زبان و بیان کی خوبی قابل داد ہے۔

نواب صاحب کا عہدِ حکومت اور آپ کی ذات اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اس سے اُردو ادب کو گراں قدر فائدہ پہونچا۔ اُردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے آپ نے بیش از بیش روپیہ صرف کیا۔ تعلیم کو عام کرنے اور قومی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام آپ ہی کے عہد کا اہم ترین واقعہ ہے۔ حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی آپ نے اُردو ادب اور تعلیم کی ترقی کی خاطر گراں قدر رقوم بطور عطیہ دیں۔ ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں سے شاید ہی کوئی درسگاہ ایسی ہو جسے آپ کے چشمۂ فیض سے فیضیاب ہونے کا موقع نہ ملا ہو۔ ذیل میں بطور تبرک آپ کا کلام درج کیا جاتا ہے۔

محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی — ابھی حصے میں ہیں کیا جانئے کیا سختیاں باقی

گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہوگئے رخصت — مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی

سلاطین سلف سب ہوگئے نذرِ اجل عثمان

مسلمانوں کا تیری عظمت سے ہے نشاں باقی

میکش

ان کا نام صاحبزادہ میر محمد علی خاں ہے۔ نظام حیدرآباد کے خاندان سے

تعلق رکھتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ ــــء میں انتقال ہو گیا۔

حیدرآباد کے جدید شعراء میں میکش کا مقام بہت ممتاز ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ میکش کی شاعری عصرِ حاضر کے مسائلِ حیات کی ترجمان ہے۔ زندگی اور کائنات کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر سے انھوں نے نقاب کشائی نہ کی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مسائلِ حیات بیان کرنے کے لئے انداز نہایت دلکش اختیار کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں بڑی موسیقیت ہے۔ انھوں نے ایسے مترنم الفاظ اور ایسی نغمہ بار تراکیب استعمال کی ہیں جو سننے والوں کو نغموں کے جزیروں میں پہونچا دیتی ہیں۔ مگر ایسے جزیروں میں نہیں جہاں پہونچ کر انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ بلکہ ایسے عالم میں جہاں ان کی نظمیں سننے اور پڑھنے والوں میں حرکت و عمل پیدا کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جوش سے بہت متاثر ہیں۔

میکش نے نظمیں اور غزلیں دونوں لکھی ہیں۔ اُن میں بعض غزلیں تو نظموں سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بہت سوز و گداز ہے۔ بڑی نغمہ آگیں کیفیت ہے۔ زندگی اور اس کی حرکت کا احساس ہے۔ ان کی غزلوں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا حسین امتزاج ہے۔ نمونۂ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اضطراب

کتنی بھولی ہے تو شبِ مہتاب — دے رہی ہے مجھے سکوں کا پیام
کیا کروں میں سکون کو لے کر — زندگانی ہے اضطراب کا نام
یا تو مجھ کو یونہی تڑپنے دے — یا بدل ہی دے زندگی کا نظام

غزل

عشق کی بیقراریاں نہ گئیں — حسن کی پردہ داریاں نہ گئیں
وجہِ اُلفت بیان ہو نہ سکی — مر مٹے راز داریاں نہ گئیں
ہم نے سو طرح جی کو بہلایا — اس کی آشفتہ کاریاں نہ گئیں

منظورؔ سید علی منظور نام، منظورؔ تخلص۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر ہی میں داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا۔ چند سال سٹی ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ مدرسۂ صنعت و حرفت ازمائی میں بھی تربیت حاصل کی۔ مدرسۂ نظامیہ میں بھی داخلہ لیا۔ ۱۹۲۶ء میں مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔

منظورؔ کی شاعری کا آغاز زمانۂ طالب علمی ہی سے ہو گیا تھا۔ انھوں نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد ترقی کر گئے۔ منظورؔ حیدرآباد کے اعلیٰ درجے کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُن کی نظمیں جدید رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے زندگی اور وقت کے مقتضیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ مگر اس میں بہت اعتدال سے کام لیا ہے۔ جذبات کی شدت سے انھوں نے عمداً دامن بچایا ہے۔ ان کی غزلیں سادگی و پرکاری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان غزلوں میں سے بعض کی زمینیں بالکل نئی ہیں جو خود انھوں نے نکالی ہیں۔

اُن کی غزلوں کے مطالعہ سے دھیمی دھیمی آنچ کا احساس ہوتا ہے۔ انتخاب

کلام درج ذیل ہے۔

وقت کی چیز

سب جسے انتہا کہیں تو اسے ابتدا سمجھ — ہو نہ اسی سمجھ پہ خوش یونہی قدم بڑھائے جا
ذوقِ سفر گھٹا نہ دے، لوگ کہیں جو نا سمجھ — حاصلِ مدعا کو بھی پرتوِ مدعا سمجھ
اور بلندیوں پہ جا، رازِ عروج کا سمجھ

غزل

غم کا گماں یقینِ طرب سے بدل گیا — احساسِ عشق حسن کے سانچے میں ڈھل گیا

ان شوخ نگاہوں نے تڑپ اور بڑھا دی — اللہ! ابھی دردِ جگر کم نہ ہوا تھا

منزلوں کی سختی کا غم نہیں خوشی یہ ہے — کس ہجوم حسرت میں ہم نے راستہ پایا

اختر سید علی اختر نام اختر تخلص ان کے والد کاسگنج ضلع ایٹہ (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ اختر کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی اور انہوں نے وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ فارسی ادب میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ عرصہ دراز سے ریاست حیدرآباد میں مقیم تھے۔ اور اسی سرزمین کو وطن بنا لیا تھا۔ ریاست کے محکمۂ آبکاری میں ملازم تھے۔ تقسیم کے بعد کراچی میں آ گئے ہیں۔

اختر حیدرآباد کے نہایت بلند پایہ اور مشہور شاعر ہیں۔ کلام میں سوز و گداز اور تڑپ ہے۔ یعنی وجد اور حرکت و عمل کے پیغامات بھی دیتے ہیں۔ الفاظ پر بڑی قدرت ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ خیالات بہت بلند اور

بعض جگہ بہت اچھوتے ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

وہی سوز، سوزِ حیات ہے جو رگوں میں گرمیٔ خوں ہوا
وہی نالہ، نالۂ درد ہے جو کسی کے دل میں اتر گیا

اثرِ بہار طرب فزا یہ حسین دائرۂ فضا
دلِ زار تو بھی ہو شادماں کہ وہ غم کا وقت گذر گیا

زندگی خواب سہی، خواب کی تعبیر تو ہو
پھر آسائشِ منزل کوئی تدبیر تو ہو

کٹ کے گر جائے گی اے قیدیٔ زندانِ ستم
تجھ کو احساسِ گراں باریٔ زنجیر تو ہو

وجد سکندر علی نام۔ وجد تخلص۔ ۱۹۱۴ء میں بیجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۳۰ء میں شعر و سخن کا آغاز ہوا۔ کلام کے دو مجموعے "لہو ترنگ" اور "آفتابِ تازہ" شائع ہو چکے ہیں۔

وجد حیدرآباد کے اُن چند شعراء میں سے ہیں جن پر سرزمینِ دکن ہمیشہ فخر کرے گی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یوں کہنا چاہیئے کہ اُن پر تمام ہندوستان فخر کرے گا۔ اُن کی شاعری میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ایسی خصوصیات موجود ہیں جو اس دور کے شعراء میں سے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوں گی۔ وجد نے محاکات منظر کشی اور جذبات نگاری کے اعتبار سے اردو شاعری کو سدابہار قسم کی نظمیں دی ہیں۔ اُن کی قوتِ مشاہدہ بہت گہری اور قوتِ بیان بڑی قوی اور پُر زور ہے۔ اُن کا شعور بہت پختہ اور بیدار ہے۔ انہوں نے مناظر اور احساسات کی نہایت کامیاب مصوری اور ترجمانی کی ہے۔ اُن کی نظموں نے مسائلِ حاضرہ کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کر لیا ہے۔ اُن کی غزلوں

میں بھی بڑی زندگی اور رعنائی ہے۔ انھوں نے غزل کی زبان میں زندگی کے مسائل بیان کر کے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُن کا کلام ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

ایلورا

عظیم عزم تھے جانباز نقش کاروں کے ۔۔۔ خزاں کی فکر نہ ارمان تھے بہاروں کے
دلوں میں خواب تھے بیدار کوہساروں کے ۔۔۔ نظر عقاب کی تیشے تھے برق پاروں کے
تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں ۔۔۔ جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں ۔۔۔ جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی

غزل

درد کو نیچا دکھانا آ گیا ۔۔۔ چوٹ کھا کر مسکرانا آ گیا
مرثیہ خوانی سے اب گھٹتا ہے دم ۔۔۔ زندگی کا گیت گانا آ گیا
رنج ناکامی سے دل بجھتا نہیں ۔۔۔ وقت سے زور آزمانا آ گیا

مخدوم حیدرآباد کے اس شعلہ نوا اور شبنم ریز شاعر کا پورا نام مخدوم محی الدین ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ بلکہ جنوبی ہند کی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما ہیں۔ آزادیٔ وطن کی خاطر متعدد بار قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں۔ آج کل حیدرآباد اسمبلی کے ممبر ہیں۔

مخدوم نہ صرف جنوبی ہند کا بلکہ غیر منقسم ہندوستان کا عظیم شاعر ہے۔ وہ نئے ادب کے معماروں میں سے ہے۔ اُن لوگوں میں سے ہے جنہوں نے ہندوستان کے غلاموں میں غلامی کا شدید احساس پیدا کیا کہ وہ حصولِ آزادی کی خاطر مارنے اور مرنے پر تیار ہو گئے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے۔ جو دوسروں کو تو جہدِ عمل کی تلقین کرتے ہیں مگر خود عشرت کدوں میں دادِ عیش دیتے رہتے ہیں۔ اُس نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کو جو پیغام دیا اس پر خود عمل پیرا ہو کر دکھا دیا۔ اُس نے نعرۂ آزادی بلند کرنے کے جرم میں دنوں نہیں بلکہ مہینوں خانہ بدوشی اور روپوشی کی زندگی بسر کی اور اس دوران میں طرح طرح کے مصائب برداشت کئے کئی بار اسیر ہوا مگر اپنے موقف سے ایک انچ نہیں ہٹا اور حریت پسند جماعت کی سربراہی کرتا رہا۔ غرض مخدوم ایک عملی آدمی ہے وہ سپاہی بھی ہے، رہنما بھی ہے اور عظیم شاعر بھی ہے۔ اُس کا احساس بہت نازک اور شدید ہے۔ اُس کا شعور غیر معمولی طور پر بیدار اور پختہ ہے۔ اس میں خلوص ہے۔ دیانت ہے۔ جراءت ہے۔ مردانگی ہے اور انھیں چیزوں کے مجموعہ کا نام مخدوم محی الدین ہے۔ اُس کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں دونوں کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ وہ حُسن اور محبت کے پاکیزہ اور نرم جذبات کا بھی قدردان ہے اور مفلوک الحال ہندوستان کے شکستہ حال عوام کا حامی و مددگار بھی۔ وہ عشق کی آنچ بھی محسوس کرتا ہے اور

۱۲ ذیشان اعزاز علی سے

سامراجیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلے بھی۔ اسے حسن کی دلکشی، رعنائی اور برنائی بھی عزیز ہے اور بھوکے عوام کے مدقوق و بیمار چہروں کا غم بھی۔ غرض وہ بہت بڑا حقیقت نگار ہے۔ اُس نے ہر جگہ اور ہر پیرائے میں حقیقت اور واقعیت کو پیش کیا ہے۔ بڑی صداقت اور خلوص سے۔ بڑے فن کارانہ طریقے سے۔ اُس کی عشقیہ یا رومانی نظموں کا لوچ، سوز و گداز، خوش گوار سی چبھن، حسن کی دلکشی اور محبوب کی محبوبیت کا احساس جس قدر پیارا ہے اور اُس کا انداز بیان جس قدر دلکش اور تیکھا ہے اُسی قدر اُس کا سیاسی و قومی احساس شدید ہے۔ اُس کی قومی نظموں کے ہر ہر لفظ سے آنچ سی آتی محسوس ہوتی ہے۔ اور بعض جگہ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے اپنا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے۔ اُس کی مشہور نظم "جنگ آزادی" ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہوئی تھی کہ ہر سیاسی جلسے کا آغاز اسی سے ہوتا تھا۔ ذیل میں اُس کی رومانی اور قومی دونوں قسم کی نظموں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

پشیمانی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے، ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں

جب دلِ ناداں یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں

شب کے سناٹے میں چپکے چپکے رو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے، لب پر مناجاتیں نہ تھیں

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں، ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

بنگال

قبر کے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے مہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے

خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم

. . . .

اُمتِ مرحوم ہو یا ملتِ زنار دار　　ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن، شیخ و برہمن، سب قطار اندر قطار　　آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچوں کی پکار
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم

. . . .

آج اپنا گھر، عدو کی رہگذر ہی کیوں نہ ہو　　ہم بڑھے جائیں گر رستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائیں گے، دشمن بد گہر ہی کیوں نہ ہو　　اپنی وردی خاک و خوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم

. . . .

آخر میں "جنگ آزادی" کے بھی دو تین بند دیکھتے چلئے۔

جنگِ آزادی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی　　محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی　　دہقانوں کی، مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟　　دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا، دنیا کیا ہو گی؟　　جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا؟　　مزدور کا جس میں راج نہ ہو

لو سُرخ سویرا آتا ہے — آزادی کا، آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے — آزادی کا، آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے — آزادی کا، آزادی کا[1]

حمایت علی شاعر ان کا نام حمایت علی، اور تخلص شاعر ہے۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر ہیں۔ جدید مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی شاعری میں عہدِ حاضر کے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خصوصاً عوام کے مسائل ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ بعض نظمیں ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔ اسلوب میں دلکشی ہے۔ انتخاب الفاظ اور اُن کی نشست کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک نظم "زندگی اور پتھر" کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ نظم سے پہلے ایک وضاحتی نوٹ بھی درج ہے۔

"کچھ مہینے ہوئے ڈائرکٹر کشور ساہو اپنی فلم "کالی گھٹا" کے کچھ مناظر فلمانے کے لئے اجنتا اور ایلورہ جانے والے تھے۔ پتھر کے ان شہروں کو راستہ اورنگ آباد ہو کر جاتا ہے ــــ اورنگ آباد زندگی کا شہر ہے۔ یہ نظم کشور ساہو سے اسی ملاقات کا ایک تاثر ہے:"

اجنتا کا نظارہ کرنے والو — اِدھر بھی اِک نگاہِ طائرانہ
صنم خانے یہاں بھی کچھ ملیں گے — ذرا ذوقِ تجسس آزمانہ

یہ شاہوں اور راجاؤں کی بستی — گناہوں کی کمیں گاہِ مقدس
محل زادوں کے حق میں خلد ساماں — رعایا کے لئے تاریک مجلس

---

[1] "سُرخ سویرا" مخدوم محی الدین۔

یہی جنت، یہی تاریک مجلس — مرے گیتوں کے نغموں کا وطن ہے
سحر میں جن کو کفنایا گیا ہے — یہ ان خورشید پاروں کا وطن ہے

یہ گرد آلود، کچے راستوں پر — شکستہ جھونپڑے، گرتے ہوئے گھر
کسی بوڑھے کی آنکھوں کی طرح چپ — کسی بیوہ کے دامن کی طرح تر

یہ انساں، ہند کے آزاد انساں — جھکے شانے، افسردہ رُخ، نظر چپ
سُنائیں کس کو آہوں کا فسانہ — خدا چپ، ناخدا چپ، بحر و بر چپ

اجنتا کا نظارہ کرنے والو! — اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا پتھروں کی زندگانی — یہ بستی زندگی کا بت کدہ ہے

نظر حیدرآبادی | حیدرآباد کے جواں سال شاعروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں مشہور حیدرآبادی شاعر علی اختر کے صاحبزادے ہیں کلام سے پختگی ظاہر ہوتی ہے ان کے یہاں زندگی کے حوادث سے نبرد آزما ہونے کی اُمنگ پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

ہوائیں اسکی ہیں، گل اسکے ہیں چمن اُس کا — جو آپ خالقِ دورِ بہار ہوتا ہے
جھجک نہ موجِ حوادث کی تیز گامی سے — جو ڈوبتا ہے وہ دریا کے پار ہوتا ہے
نظر! جو وسعتِ افلاک سے ہو بیگانہ — وطن میں رہ کے غریب الدیار ہوتا ہے

شاذ تمکنت | حیدرآباد کے نئے شاعر ہیں "ادب لطیف" اور بعض دوسرے پرچوں

۱؎ ۱۹۵۱ء بہترین ادب - مرتبہ مرزا ادیب

میں ان کا کلام شایع ہوتا رہتا ہے۔ مناظر کی بہت اچھی تصویر کشی کرتے ہیں۔ مزاج میں جدّت ہے جو کہیں کہیں بے راہ روی بھی پیدا کر دیتی ہے۔ نظموں میں تاثر ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک نظم "حرفِ شب" کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

نقرئی گرد میں چپ چاپ کھڑے ہیں اشجار
جگنو اڑتے ہیں کہ سمیٹے ہوئے شعلوں کی لپک
تارے جس طرح گھنی جھاڑیوں کی گود بھریں
پھیلتی جاتی ہیں سایوں کی مقدس مہکیں
کروٹیں لیتی ہیں ہریالی کی سوندھی لپٹیں
یہ سجل رین یہ سنگیت یہ تاروں کی پھبن
کون سن پائے گا فطرت کی زبانِ معصوم
جانے کب دیدۂ انسان میں ٹھنڈک اترے گی
ذہن کے دامنوں میں غنچوں کی مہک اترے گی
اے مری جھوٹتی! اٹھلاتی زمیں کروٹ لے
دلِ ہر ذرہ دھڑکتا ہے کہیں آہٹ لے

سلیمان ادیب یہ بھی حیدرآباد کے اچھے شاعروں میں سے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں ادبِ لطیف[1] اور بعض دوسرے رسالوں میں ان کی نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

آنکھوں پہ الزام بہت ہیں!	طعنہ بہت ہیں بام بہت ہیں
اپنی خوشی سے تیری خوشی تک	عشق میں تیرے کام بہت ہیں

---

[1] ادب لطیف

لب پہ آہیں، سینے خالی — ایسے عاشق عام بہت ہیں
غنچہ، شبنم، جام، انگارہ — دل کے اور بھی نام بہت ہیں
پیار سے جرم نہیں ہے — لیکن ہم بدنام بہت ہیں [1]

زہرہ نگاہ زہرہ نام ہے۔ نگاہ تخلص۔ حیدرآباد کے ایک معزز خاندان کی صاحبزادی ہیں۔ چند سال ہوئے لاہور کے ایک مشاعرہ منعقدہ پنجاب یونیورسٹی ہال میں شرکت کرنے کی غرض سے تشریف لائیں۔ پڑھنے کا انداز بڑا پیارا اور دلکش خیالات بہت اچھوتے ان خصوصیات نے سامعین پر کچھ ایسا اثر کیا کہ انھوں نے داد و تحسین کے بے تحاشہ پھول برسانے شروع کر دئے۔ اور حیدرآباد کی یہ کمسن اور گمنام شاعرہ زندہ دلانِ پنجاب کی زندہ دلی کے ہاتھوں دیکھتے ہی دیکھتے شہرت اور ناموری کی بلندیوں پر پہونچ گئی۔ نگاہ نے بہت جلد ترقی کی اور اچانک ترقی کی۔ ایسے لوگ عموماً ختم بھی اتنی ہی جلدی ہو جاتے ہیں۔ مگر نگاہ ان لوگوں سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے کلام میں بڑی پائداری ہے سطحیت نام کو نہیں ہے ان کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت گہری ہے اور سوچنے کا انداز بہت صحت مند۔ انھوں نے رومانی شاعری اور غزل کے فرسودہ روایتی انداز سے ہٹ کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس میں خلوص بھی ہے اور انسانیت کا درد بھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں ایک عورت کا شعور اس قدر بیدار اور گہرا ہو بڑے تعجب کی بات ہے۔ ذیل میں انکی ایک غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں — تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لئے
جہانِ نو کا تصور، حیاتِ نو کا خیال — بڑے فریب دئے تم نے بندگی کے لئے
کہاں کے عشق و محبت، کدھر کے ہجر و وصال — ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لئے
مئے حیات میں شامل ہے تلخیٔ دوراں — جبھی تو پی کے ترستے ہیں دوستی کے لئے [2]

---

[1] بہترین ادب ۱۹۵۲ء ادب لطیف

دورِ آصفیہ میں — اُردو نثر

دورِ آصفیہ جس طرح نظمِ اُردو کے لئے حیات آفریں ثابت ہوا۔ اسی طرح اُردو نثر کے لئے بھی حیاتِ نو کا پیغام لے کر آیا۔ اس دور میں نہایت اعلیٰ پایہ کے نثر نگار پیدا ہوئے اور علوم و فنون کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والی نہایت قابل قدر اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی گئیں۔ دربارِ آصفیہ کی طرف سے بھی اُردو نثر اور نثر نگاروں کی سرپرستی کی گئی خود مہاراجہ سری کرشن پرشاد اچھے شاعر ہونے کے ساتھ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے مہاراجہ بہادر کی سرپرستی اور نثرِ اُردو سے ذاتی دلچسپی نے اُردو نثر کو آگے بڑھنے میں بہت مدد دی۔ مہاراجہ شاد کے علاوہ حیدرآباد کے امراء میں سے ایک اور شخصیت بھی نثرِ اُردو کی بہت بڑی محسن تھی اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس شخصیت کی سرپرستی میسر نہ آتی تو اُردو نثر کا کارواں بہت پیچھے رہ جاتا۔ وہ شخصیت شمس الامراء نواب محمد فخر الدین خاں کی ہے۔ نواب موصوف سنہ ۱۱۹۴ھ میں بمقام برہان پور پیدا ہوئے۔ اور سنہ ۱۲۷۹ھ میں فوت ہوئے دربارِ آصفیہ میں ان کا غیر معمولی اثر و رسوخ تھا۔ نظام حیدرآباد کے داماد بھی تھے۔ بے اندازہ جاگیروں اور دولت و ثروت کے مالک تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ تعلیمی مسائل میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے جیب خاص سے زرِ کثیر صرف کر کے ریاست کے مختلف حصوں میں متعدد مدارس قائم کروائے لاتعداد غریب طلبہ کے تعلیمی مصارف برداشت کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نواب موصوف نے اُردو نثر کی علمی کم مائیگی کو بھی محسوس

کیا، اور مغربی زبانوں کی بہت سی کتابوں کو اُردو میں ترجمہ کروا کر اُردو نثر کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ نواب موصوف کے ذریعہ سے ریاضی، کیمسٹری، ہیئت اور حیوانات وغیرہ علوم کی مفید اور معلومات افزا کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ نواب شمس الامرا مرحوم کی توجہ اور اُردو نثر کی سرپرستی ہی کا نتیجہ تھا کہ حیدرآباد کے اہلِ قلم نے اس طرف توجہ کی اور صرف اُن کے زمانے ہی میں نہیں بلکہ اُن کے بعد بھی جوں جوں زمانہ گذرتا گیا لوگ اُردو نثر کی بڑھ چڑھ کر خدمت کرتے رہے اور مندرجہ بالا علوم کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، طب، منطق، فلسفہ، سوانح، صنعت و حرفت، ناول، ڈرامہ، افسانہ اور تنقید۔ غرض علم و ادب کے ہر شعبے سے متعلق اعلیٰ پائے کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ترجمہ بھی اور طبع زاد بھی اس دور میں اُردو صحافت نے بھی ترقی کی اور جنوبی ہند سے روزنامہ، ماہنامہ اور ہفتہ وار اخبارات رسائل جاری ہوئے جن میں سے بعض نے اس قدر ترقی کی کہ اُردو صحافت کی تاریخ میں بلند ترین مقام پر فائز ہو گئے۔

ذیل میں دورِ آصفیہ میں اُردو نثر کی ترقی کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے گا اور قابلِ ذکر تصانیف اور ان کے مصنفوں کے حالات بھی درج کئے جائیں گے۔ اُردو نثر کے نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

حکایاتِ بہارِ دانش | ان حکایات کو اُردو زبان کا لباس پہنانے والے شخص کا نام محمد اسماعیل تھا۔ محمد اسماعیل انگریزی فوج میں ملازم تھے اور انگریز فوجیوں کو اُردو پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی حکایات بہ اعتبار زبان اور اندازِ بیان نہایت صاف ہیں۔ پیچ دار اور اُلجھے ہوئے اندازِ تحریر سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ تحریر میں بہت بیباکی ہے جو بعض جگہ عریانی کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ یہ حکایتیں بغیر عنوانات کے ہیں۔ ہر حکایت کے آخر میں نصیحت آمیز

نتائج بھی درج کر دئے گئے ہیں جن سے اُن کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ شاید اُس وقت تک مونث اور مذکر ۔ ۔ ۔ ۔ میں امتیاز نہیں تھا۔ اسی لئے ان حکایتوں میں بھی اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بعض الفاظ کا املا بھی موجودہ دور کی عبارت کے املا سے مختلف ہے بعض اُردو و ہندی الفاظ کی جمع فارسی قاعدے سے بنائی گئی ہے بعض جگہ علامت فاعل "نے" حذف کر دی گئی ہے۔ یہ نقائص اس عہد کی بیشتر کتابوں میں موجود ہیں۔ نمونے کے طور پر ان حکایات کے دو اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔

" ایسا کہتے ہیں کہ بیچ ملک ہند کے ایک شہر میں برہمن تھا۔ اوس برہمن کو ن جورو بھوت حسین تھی کہ صورت اُس کی ماہ تاب دیکھ کر شرمندہ رہتا تھا۔ اور بھواں اُسکی قوس قزہ کی موافق تھی اور آنکھیاں مانند ہرن کی اور ناک مثال کھانڈیکی اور ہونٹاں مثال یاقوت کی تھی اور داتاں مثل موتیوں کی تھی اور چھاتی مثال آئینہ کی صاف تھی اور جوبن میں مثل قبہ نور کی اور کمر مثال چیتی کے باریک۔"

" روایت کرنی ہاری خبروں کی ایسے روایت کرتی ہیں کہ بیچ ملک دکھن کی ایک پادشاہ رہتا تھا اوس بادشاہ کو سات بیٹے تھے ایک روز وہ ساتوں شہزادے واسطے شکار کی بادشاہ سی آکر رخصت مانگی بادشاہ رضا دیا اور فوج اپنی ہمراہ کیا۔ جب یہ ساتوں شہزادی درستی شکار کی طرف یک جنگل کی گئی لاکن کہیں یک جانور چرند نظر نہیں آیا۔"

ترجمہ انوار سہیلی اس شہرۂ آفاق کتاب کا دُنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دکھنی اُردو میں بھی اس کے متعدد ترجمے ملتے ہیں مگر ان میں سے سوائے ایک کے باقی کسی ترجمے پر مترجم کا نام یا سن ترجمہ

درج نہیں ہے۔ وہ ترجمہ جس کے مترجم کا نام درج ہے میاں محمد ابراہیم بیجاپوری کا ہے۔ انہوں نے سنہ ۱۲۴۰ھ مطابق سنہ ۱۸۲۴ء میں اسے اُردو کے قالب میں منتقل کیا تھا۔ میاں ابراہیم خود اُن کے قول کے مطابق ملک حسین خاں بن شیخ محمد بیجاپوری (جمعدار دکھنی ہزار سواری) کے بیٹے تھے اور زمانۂ زیرِ بحث سے تعلق رکھتے تھے۔ ذیل میں اُن کے ترجمے کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

"چین کے ملک کے اورسی چورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا۔ اس کا نام ہمایوں فال ہور اسے ایک بڑا ایکا وزیر تھا اُس کا نام خجستہ رائے ہمایوں فال ایک بار خجستہ رائے کو سات لے کر شکار کو گیا۔ وہاں سوں اُٹھے تو دھوپ پڑی تھی۔ ایک پہاڑ کی انی پو جھاڑاں تھے چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو سات لے کر اس چھاؤں کے تلے جا بیٹھا اور دیکھا تو کیا کہ ایک جھاڑ اُس کا کھوڑ کا ہور بڑا ہو گیا ہے اس کے اندر شہد کے مکھیاں پوتی بند نے اندر گھستے اور بہار نکلتے ہیں۔ ہمایوں فال خجستہ رائے سوں پوچھا یہ کیا ہوں گا اُنے بولیا یہ شہد کی پوتی ہے۔ بادشاہی عملاً فعلاً سگل ان کے ہاں ہے جمشید نے بادشاہی کرنا ان سوں سیکھا ہمایوں فال بولیا ارے میاں وزیر دنیا بڑی کھٹ کی ہے اس سوں بہتر ہے کہ سب چھوڑ دیکر کونا پکڑنا خجستہ رائے بولیا تمہارے سو رعالم کا بھلا ہوتا ہے تمنا کونا پکڑ کو کیا نفع۔ عدالت سوں بادشاہی کرے تو دنیا میں ہور دین میں دونو جگہ بھلائی ہے"۔

ترجمہ گلستانِ سعدیؒ جنوبی ہند کے مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستان کے دکنی اُردو میں ترجمے کئے ہیں۔ جن میں سے بہت سے یورپ میں محفوظ ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان ترجمہ کرنے والوں میں سے کسی کا نام یا حالات اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکے۔ ان میں سے

بعض تراجم کی زبان اور اسلوب نگارش سلیس، صاف اور نسبتاً شستہ ہے جیسے:-

"سنا ہوں کہ یک بادشاہ کسی بیگناہ بندی کی قتل پر چشم غضب سے اشارہ کیا۔ وہ بیچارہ اپنے جان سے اٹھا کہ حکم حاکم مرگِ مفاجات اور اپنی زبان میں بادشاہ کو گالیاں دینے اور اُس کی حضور پرنور میں نالائق باتیں بے تامل زبان پر لانے لگا۔"

لیکن بعض ترجمے زبان و بیان اور الفاظ کے محل استعمال کے اعتبار سے مندرجہ بالا اقتباس کے مقابلے میں زیادہ مشکل، ناہموار۔ اور بعید الفہم ہیں مثلاً:-

"جہاں ای بھائی نا رہی سات کسی کی دل بیچ جہان کون پیدا کرنی ہے ہار یکی بند کر بس ہی مت دی ٹیکا ہور پیت ادپر ملک ڈینا ئی گیا واسطی کہ او تجہ سریکی ہولوں کون پالی ہور مار والی جب جانے کا ارادہ کری جان پاک تخت پر مرنا کیا ہور مستی پر مرنا کیا۔"

خاتمہ کتاب کی عبارت کا ایک نمونہ بھی دیکھتے چلئے۔

"بیچ بیان گلستان کی تمامت کی کہتا ہے کہ خدائے بزرگ ہور بلند کی مدد سیں کتاب تمام ہوئی ہے۔ جیسا کہ دستور اور مولفان کا ہی ہوتا قدیم تار رہی۔۔۔۔"

قصہ انار رانی یہ دکھنی زبان میں پریوں کی داستان ہے مصنف کا نام درج نہیں ہے، نہ سن تالیف دیا گیا ہے، مگر اسلوب نگارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصہ بھی زمانہ زیر بحث ہی کا ہے۔ کچھ نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

"کہتے ہارے خبروں کے مصدر عاقلاں آگے کے۔ کہتے ہیں کہ بیچ ملک ہندوستان کے ایک بادشاہ تھا کہ سخاوت اور جوانمردی اور عدالت میں مانند اُس کے دنیا میں کم اور خزانے اور سونا روپا اور زر و جواہر اور اسباب و سپاہ حد سے زیادہ تھے"

"لاکن اوس بادشاہ کو سوای اولاد کی کچ دل میں آوز و نہیں تھی اور ہمیشہ واسطے اولاد کی بیچ درگاہِ خدا تعالیٰ کی دست بدعا تھا اور رات ہور دن یاد میں

اللہ کسے رہتا۔"

"جو شخص کر اوس باغ کو آتا اوس باولی کی طرف کرتا اوس پھول کو دیک کر توڑنی کی خاطر قصد کرتا لاکن وہ پھول کسے کی ہات نہیں ہوتا اسے طرح سے یہ بات تمام شہر میں مشہور ہوئی اور رفتہ رفتہ ان چاروں شہزادوں کوں خبر ہوئی واسطی سیر کے اس باغ کون چاروں شہزادی ملکو گئے۔ انار رانی کو ایک بہوت خوش ہوئی اور چھہ ہینے رات اور چھہ مہینے دن کی شادی بڑی دہوم سے کئے بعد ازاں شاہزادہ اور انار رانی باقی عمر بیچ عیش و عشرت کے گزاری۔"

قصۂ بندگانِ عالی یہ قصہ خلیفہ ہارون الرشید سے متعلق ہے۔ سنہ تصنیف اور مصنف کا نام دونوں سے بے نیاز ہے۔ مگر اندازِ تحریر صاف غمازی کر رہا ہے کہ یہ بھی اسی عہد کی تصنیف ہے۔

" اے یاران دوستان اگر چاہتے ہو کہ یہ نقل عجیب کو سنا ساتھہ کان اشتیاق کے سنو کہ پچھلے دنوں بیچ عہد الضحی کے خلیفہ ہارون الرشید واسطے تماشا اور سیر کے بیچ شہر بغداد کے ایدھر اودھر پھرتا چاہا اوس وقت اس کے ساتھ کوئی رفیق ہمراہ نہیں تھا۔"

" واسطے ...... پہچانیکی خاطر یک پگری بہوت بری اور بھاری سر پر باندہکر اور بدن میں ایک قبای چرمی پہن کر اور۔ کمر میں بہوت چوری یک کمر بند چرمی پانچ تسمیں کے مذبوت باندکر اور موزی چہوٹی سی بدصورت اور موتی پاؤں میں پہن کر ایسی تصویر عجیب ڈراونی بناکر کر اگر دربار میں خلیفہ کی جاکر کہری رہی تو کوئی نہ پہچانی کہ یہ خلیفہ ہے۔"

خاتمہ کتاب کی عبارت کا نمونہ بھی دیکھئے۔

" جب خلیفہ نے اس عورت کو سب عورتوں میں پیشوا بنایا اور اپنی عیش و عشرت

میں مشغول رہا اور بوڑھی جس وقت کہ خلیفہ کی اول پوشاک کو دل میں تصور کرتی اور چور و بد کہنے سے اپنی بہوت پشیمان ہوئی۔"

تاریخ خورشید جاہی غلام امام خاں "المتخلص بہ ترجمہ" نے تاریخ رشید الدین خانی اور تاریخ خورشید جاہی کے نام سے ہندوستان کی تاریخ قلم بند کی ہے جو ہندو راجاؤں اور مختلف سلاطین ہند کے حالات اور ان کے جنگی کارناموں پر مشتمل ہے۔ غلام امام خاں نے آصف جاہ میر محبوب علی خاں والی دکن کا زمانہ پایا تھا انھوں نے شمس الامرا، اقتدار الملک محمد رشید الدین خاں کے بیٹے خورشید الامرار سرخورشید جاہ محمد محی الدین خاں کے ایما سے جو تاریخ مرتب کی تھی۔ . . . . اس کا نام تاریخ خورشید جاہی رکھا ہے اور اس سے پہلی تاریخ شمس الامرا محمد رشید الدین خاں کے ایما سے لکھی تھی اس کا نام تاریخ رشید الدین خانی تجویز کیا ہے۔

تاریخ خورشید جاہی بڑی تقطیع کی بہت ضخیم کتاب ہے جو خط شکست میں لکھی ہوئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے اس میں صفحات پر نمبر درج نہیں ہیں۔ فہرست مضامین آخر میں درج کی گئی ہے۔ اغلاط نامہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کا کاغذ بادامی رنگ کا ہے جو بہت کھرا ہے۔

ذیل میں اس کتاب کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"سلطان ابوالحسن قطب شاہ کا بیان:۔ سلطان ابوالحسن قطب شاہ عرف تاناشاہ کہ وہ داماد عبداللہ قطب شاہ کا تھا بعد اس سلطان کے اعانت سے سید مرتضیٰ اور مادنا اور . . . . . کہ وے دونوں بھائی پیشکار سید موصوف کے تھے سریر سلطنت پر قایم ہوا اور سید موصوف کو وزیر اپنا کیا بعد چند روز کے وزیر نے چاہا کہ بادشاہ کو مطیع اپنا کرلے بادشاہ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اور بذر رنج مادنا کو جو پیشکار مستقل اس کا تھا دمساز اپنا کر کے قلمدان وزارت کا سید موصوف سے لے کر سپرد

برہمن مذکور کے کیا کہتے ہیں کہ ابو الحسن عیاش مزاج تھا پروا امور مملکت کی اس کو بالکل نہ تھی پس برہمن مذکور نے عہد وزارت میں اپنے اسلام کو ضعیف کر دیا باہر شہر کے بتخانے بنائے اور جب روز تہوار کا آیا وہاں گیا اور سادات اور شرفائے اہلِ اسلام کی اہانت کی۔ وے لوگ جو ہمراہ تھے اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے پس اسی دن سے سلسلہ نیکنامی اس خاندان کا ٹوٹا اور شامت میں اس کی وزیر اور بادشاہ دونوں گرفتار ہوئے . . . . "

مہاراجہ شاؔد کی نثر

یمین السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاؔد جن کی شاعری پر گذشتہ صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ صوفی منش شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے نثر نگار بھی تھے۔ موصوف نے مختلف علوم پر گرانقدر کتابیں لکھی ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی وسعتِ معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مہاراجہ موصوف عربی و فارسی کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان پر شیفتہ بھی تھے۔ چنانچہ وہ جہاں جہاں اسلامی معاشرت اور بزرگان اسلام کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کے دلی جذبات الفاظ کی صورت اختیار کر کے صفحۂ قرطاس پر پھیل جاتے ہیں۔ مہاراجہ کا اسلوبِ نثر بہت عام فہم اور سیدھا سادہ ہے۔ زبان اور خیالات دونوں نہایت پاکیزہ ہیں۔ عبارت میں کہیں الجھاؤ اور گنجلک نہیں ہے۔ بعض جگہ محاورات یوں استعمال کرتے ہیں جیسے مرصع ساز انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیتا ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ مہاراجہ شاؔد کے پردے میں رتن ناتھ سرشار لکھ رہے ہیں، انھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے معلومات کے دریا بہا دئے ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک کتاب سفرنامہ کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان شہروں کے حالات بیان کئے ہیں جہاں جہاں دورانِ سفر میں انہوں نے قیام کیا۔ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ

کتاب معلومات کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ اس سفرنامے سے اُس دور کے شہروں کے حالات پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کی ابتداء میں ایک تمہید ہے جس میں فوائد سفر بیان کئے گئے ہیں اور اس کے بعد اسباب سفر کے عنوان سے اصل کتاب شروع ہو جاتی ہے۔ "اسباب سفر" کے زیرِ عنوان مہاراجہ موصوف نے اپنے سفر کی وجہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شرکت بیان کی ہے۔ اس کے بعد حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح عمری اور اجمیر کی عام حالت کا بیان ہے۔ اور پھر تاریخ وار سفر کے حالات شروع ہو جاتے ہیں۔ اب ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:-

بمبئی کی حالت پر ایک اجمالی نظر

" اگرچہ کلکتہ باعتبار آبادی، وسعت و تجارت و تہذیب اور ہندوستان کا دارالخلافہ ہونے کے لحاظ سے بڑا ہو۔ لیکن اگر بمبئی کی عام حالت پر نظر ڈالی جائے تو یہاں کے باشندوں کی عام خوبصورتی، عورتوں کی عشوہ کاری و حسن فروشی اور آزادانہ سادگی سمندر کے نظارے، موسم کا اعتدال، تجارت کی گرم بازاری ہر دیکھنے والے کو اس مصرعہ کے پڑھنے پر مجبور کر دے گی کہ

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

یورپین سیاح اس بمبئی کو "ہندوستان کی آنکھ" کہتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ایشیا میں دوسرا شہر اس کے مقابل کا نہیں۔

اس شہر میں بارہ اسٹیشن ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ بائی کلا، گرانٹ روڈ، چرنی روڈ، میرن لائین، چرچ گیٹ اسٹریٹ، مہالکشمی، پیرل، الفنسٹن روڈ اور وکٹوریہ ٹرمی نس اور قلابہ وغیرہ"

"اس شہر کے بازار بہت لمبے اور دلی کی چاندنی چوک کی طرح کشادہ ہیں۔ دونوں جانب بڑے اونچے اونچے محل نما عالی شان مکان آسمان سے باتیں کر رہے ہیں جن میں زیادہ کام پتھر کا ہے۔ سڑکوں پر ٹریموے کی دوہری لائینیں ہیں جن کے آس پاس گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے پکی سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ بازاروں میں ہر وقت وہ بھیڑ بھاڑ رہتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک طرف سے ہوا کی طرح ٹریموے دوڑی جاتی ہے، دوسری طرف سے موٹر زمین کی طنابیں کھینچتی آتی ہے۔ تیسری طرف گاڑی والا بچو بچو کی صدا لگا رہا ہے، چوتھی طرف بائیسکل والا ٹن ٹن کی خوشنما آواز سنا رہا ہے۔ اس پر بھی راہ گیروں کی وہ ریل پیل ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔"[1]

نواب عزیز جنگ کی نثر

نواب مرحوم کا نام احمد عبدالعزیز تھا تخلص ولا دربارِ آصفیہ سے نواب عزیز جنگ اور حکومت سے شمس العلماء کے خطابات دیے گئے تھے۔ احاطہ مدراس کے شہر نیلور میں پیدا ہوئے سنہ پیدائش ۱۲۷۴ھ ہے ابتدائے عمر ہی میں حیدر آباد گئے تھے اور پھر اسی سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ابتداء میں صیغۂ عدالت سے متعلق رہے، پھر پائیگاہ وقار الامراء میں افسر اعلیٰ ہو گئے اور آخر میں صرف خاص میں صدر محاسب کے معزز عہدے پر فائز ہو گئے ربیع الاول ۱۳۴۳ھ میں انتقال فرمایا۔

نواب مرحوم اُردو اور فارسی کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے کم و بیش بیس کتابوں کے مصنف تھے علم تاریخ، سیاست قواعدِ اُردو، نباتات، حیوانات زراعت، مالیات، قانون اور جمل وغیرہ علوم و فنون پر انھوں نے نہایت معلومات انگیز اور قابل قدر کتابیں تصنیف

---

[1] "سفرنامہ" صفحات ۲۳، ۲۴، ۲۵

کی ہیں اور اُردو نثر کو وسیع کرنے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ ذیل میں اُن کی تصنیف
"غرائب الجمل" کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ یہ فنِ جمل کی تاریخ ہے اور
۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ "عزیز المطابع" سے شائع کی گئی ہے۔

"(۱) جمل کی تعریف

جُمَّل یا جُمَل بضم جیم و تشدید میم مفتوح یا بدون تشدید بفتح میم زبان عربی
کا لفظ ہے جس کے معنی حروف تہجی کو اعداد کے مقابلے میں قائم کرنے کے ہیں
جیسے الف مساوی قرار دیا جائے ایک کا۔ یا بے کو مساوی قرار دیا جائے دو کا۔

صاحب فرہنگ آصفیہ نے جیم اور میم دونوں کا مفہوم لکھا ہے اور فرمایا
ہے کہ جُمَّل سے حروف ابجد کے اعداد کا حساب مراد ہے۔ منشی انوار حسین سہسوانی
نے بھی اپنی تالیف ملخص تسلیم میں بضم جیم تازی و میم مضموم مشدد و نیز بہ تخفیف
لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جمل حساب اعداد ابجد کو کہتے ہیں . . ."

"(۲) فنِ جمل کی تاریخ

صاحب معدن الجواہر کا قول ہے کہ فنِ جمل عربوں کے اسلام سے پیشتر
بھی مستعمل تھا۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی امام محمد
بن اسحٰق المطلبی المعروف بابن اسحٰق سیرۃ میں اور امام محمد بن اسمٰعیل البخاری
نے کتاب التاریخ میں اور شیخ ابو محمد عبدالمالک بن ہشام الحمیری نے کتاب سیرۃ
میں اور نیز دوسرے محققین نے اپنی تصنیفات میں اس حدیث مبارک کا ذکر
فرمایا ہے۔ [۱] . . ."

ملا عبدالقیوم کی نثر ملا عبدالقیوم مرحوم ۱۲۷۰ھ میں بمقام حیدرآباد پیدا
ہوئے دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کی۔ نظامت

---

[۱] "غرائب الجمل" ص ۱۶ و ۱۷

تعلیم سے ملازمت کا آغاز ہوا اور تعلقداری پر اختتام۔ رمضان ۱۳۲۴ھ میں انتقال فرمایا۔ ملا عبد القیوم اعلیٰ درجے کے منتظم ہونے کے ساتھ سرگرم عمل قومی کارکن بھی تھے۔ خصوصاً نونہالانِ قوم کی تعلیم و تربیت میں ملا مرحوم نے غیر معمولی عزم و ہمت کا ثبوت دیا۔ کانگریس کے پرجوش حامی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو علم و ادب سے بھی غیر معمولی شغف تھا۔ ملّا تخلص کرتے تھے، نثر کے میدان کے بھی شہ سوار تھے۔ ذیل میں اُن کی نثر کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

" علم سیاست مدن میں یہ امر مسلمہ و تصفیہ شدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں محتاجِ معاش ہے اور وجوہ معاشِ انسانی بعض طبعی ہیں اور بعض غیر طبعی۔ ذرائع معاش فلاحت، صناعت، تجارت طبعی ہیں اور غیر طبعی ذریعہ خدمت ہے۔ اس لئے پانچ ہزار سال سے یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے "اوتم کھیتی مدھم بیپار" "چاکری کنشت بھیک ندان" اوتم کھیتی اس واسطے ہے کہ انسان اپنی پہلے یا دوسرے درجہ کی ترقی سے جو کھوؤں اور جنگلوں سے نکل کر تمدنی حالت کی طرف ترقی کرتا ہے تو زراعت پیشہ بنتا ہے اور یہ پیشہ انسان کا فطری و بسیط اور سب سے مقدم پیشہ ہے اس لئے اس کو ابو البشر آدم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور اسی کا ایجاد کردہ اور تعلیم دادہ سمجھتے ہیں۔ اکثر صحرا نشینوں اور بادیہ گزینوں کا یہی پیشہ ہے[۱]...."

راجہ اصغر کی نثر

راجہ راجیسور راؤ اصغر۔ ریاست دوم کنڈہ کے حکمراں کی حیثیت سے تو مشہور ہیں ہی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اچھے شاعر اور بلند مرتبہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ کم و بیش تیس[(۴۵)]

---

[۱] "رسالہ صحیفہ" بحوالہ "دکن میں اردو" ص ۸۱۴

کتابیں راجہ موصوف کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ جن میں ترجمے بھی ہیں اور طبع زاد بھی علم لغت پر اُن کی تصانیف نہایت بیش قیمت ہیں۔ اس کے علاوہ راجا صاحب نے بھارت اور علم تاریخ پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ذیل میں اُن کی ایک کتاب "قاموس الجدید" میں سے نثر کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب جدید عربی زبان کی لغت ہے اس میں موجودہ عرب ممالک میں استعمال کئے جانے والے دس ہزار الفاظ اور اصطلاحات درج کی گئی ہیں۔ اور ہر لفظ کے وہ تمام معنیٰ بیان کردئے گئے ہیں جو مختلف مواقع پر مراد لئے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۴۲ھ میں "مطبع اختر دکن" سے شائع ہوئی تھی۔ ابتدا میں ایک دیباچہ ہے اور پھر لغت شروع ہوتی ہے۔ پہلے دیباچے کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ اُن کے اسلوبِ نگارش کا اندازہ ہو سکے۔ اُس کے بعد اُن کی تصنیف میں سے چند عربی الفاظ اور اُن کے معانی درج کئے جائیں گے۔

"افریقیا:۔ مراکش۔ الجزائر، تونس، فُزّان، طرابلس الغرب، برقہ، مصر، صحرائے عُظمیٰ کے تمام واحات (نخلستان) مثلاً سیوہ، جغبوب اور اوکوار یہ سب اسلامی ممالک، وخطوط سمجھے جاتے ہیں ان کی اصلی زبانیں بربری ہیں اور مصر کی قبطی ہے۔ لیکن عربی عنصر اس قدر غالب ہے کہ یہ عربی زبان کے مختلف لہجے (مراکشی، جزائری، تونسی، فزانی، طرابلسی) کہے جانے لگتے ہیں ادھر کی زبان تو جہاں قدیم الایام میں السنۂ حامیہ یعنی بربری، علیفی، ہیراطیقی اور قبطی بولی جاتی تھیں) اسٹانڈرڈ (ٹکسالی یا فصیح) عربی سمجھی جاتی ہے۔ صحرا میں توارک (طوارق) رہتے ہیں جن کی زبانیں اصلاً بربری (حامی) ہیں لیکن عربی نے بہت نفوذ کیا ہے۔"[1]

---

[1] "القاموس الجدید" صفحہ ۱ و ۲

چند الفاظ اور اُن کے معانی

اخباراتِ تلغرافیہ - تار برقی کی خبریں -

آلتہ البخار - اسٹیم انجن -

آلتہ المتکلمہ - ٹیلیفون -

آلہ رافعہ - لفٹنگ پمپ -

پرنلج - جوتے کی سیاہی - سیاہ چمڑا -

تقویم السنہ - کیالنڈر -

تلغراف - ٹیلیگرام - تار برقی - دفتر تار برقی

شرکہ - انجمن - مجلس

ہَیئۃ - مجلس - شکل - وضع، کورم

عبدالجبار ملکاپوری کی نثر

مولوی عبدالجبار مرحوم بھی جنوبی ہند کے بہت اچھے نثر نگار اور مصنف تھے - پیدائش برار میں ہوئی مگر زندگی کا بہت بڑا حصہ حیدر آباد میں گذارا - درس و تدریس سے متعلق تھے - علم تاریخ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے خود بھی مورخ تھے - دکن اور اولیائے دکن کے متعلق بڑی معلومات افزا کتابیں لکھی ہیں - تذکرہ شعرائے دکن کے بھی مصنف تھے - سنہ ۱۳۴۴ھ میں وفات پائی - لکھنے کا انداز بہت سادہ تھا - اُن کی نثر تصنع و تکلف سے پاک ہے - جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اس پر لکھتے ہوئے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا ہے - خصوصاً شعرا کے تذکرے میں حالات کا اندراج کرتے ہوئے بہت چھان بین اور تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے - ذیل میں اُن کی تصنیف "تذکرہ شعرائے دکن" میں سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے - یہ کتاب سنہ ۱۳۲۹ھ میں "مطبع رحمانی" میں چھپ کر شائع ہوئی تھی -

میر حشمت علی حیدر آبادی

حشمتؔ تخلص، میر حشمت علی نام۔ آپ کا مولد و منشا حیدر آباد دکن ہے۔ آپ میر حیدر علی مرحوم کے فرزند ہیں۔ مرحوم الیہ سرکار عالی کے صدر بٹہ خانے کے میر منشی تھے آپ نے سنِ تمیز کے بعد علمائے حیدر آباد سے کتب فارسی کی تحصیل کی۔ انشا پردازی و عبارت نویسی میں خوب مہارت پیدا کی۔ مزاج میں سخن سنجی و شعر گوئی کا ولولہ تھا اور طبیعت بھی سنجیدہ تھی۔ شعر گوئی کے میدان میں آکر خوب جولانی کرنے لگے۔ حیدر حسین خاں حیدر المتوفی سنہ ۱۲۹۵ھ سے کلام کی اصلاح لیتے رہے۔ کلام سے نزاکت و ملاحت نمودار ہوتی ہے۔ آپ کی عمر تخمیناً پچاس برس کی ہوگی۔ متوسط قد، رنگ مائل بہ سیاہی۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر گاہ زندہ رکھے۔"[1]

شمس اللہ قادری کی نثر

حکیم سید شمس اللہ قادری دکن کے مشہور اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں زبان و ادب قدیم اردو اور تاریخ پر متعدد بیش بہا کتابوں کے مصنف ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ نہایت تلاش و تحقیق سے لکھا ہے۔ ان کی تحریریں مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ذیل میں اُن کی ایک کتاب "النقود الاسلامیہ" کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب جو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے عہدِ مغلیہ کے سکوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں اُس عہد کے سکوں کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب تاج پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔

"سلاطینِ مغلیہ کے بڑے سکے مسکوکاتِ عالم کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان اعجوبۂ روزگار سکوں کا وزن ۵ تولہ سے ۵۰۰ تولہ تک ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے دکن ص ۲۵۶

اور ایسے بھاری اور وزنی سکوں کو ان بادشاہوں کے سوا دنیا میں کسی بادشاہ نے مضروب نہیں کرایا ہے۔ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ) کے زمانے سے ان سکوں کی ابتدا ہوئی ہے اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال تک ہر بادشاہ کے عہدِ حکومت میں مضروب ہوئے ہیں۔

شیخ ابوالفضل علامی نے آئینِ اکبری میں اکبر کے بڑے سکوں کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے بڑے سکے کا نام سہنسہ تھا اور اس کا وزن ایک سو ایک تولہ ۹ ماشہ سات سُرخ ہوا کرتا تھا۔ اس کے ایک جانب بادشاہ کا نام اور اس کے اطراف یہ عبارت ہوتی تھی: "السلطان الاعظم الخاقان المعظم خلد اللہ ملکہ وسلطانہ ضرب دارالخلافہ آگرہ" دوسری جانب کلمہ طیبہ اور اس کے نیچے "وَاِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ" اور اس کے گرداگرد اصحابِ اربعہ رضی اللہ عنہم کے اسماء لکھے جاتے تھے ......" [2]

مولوی چراغ علی کی نثر

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم گو حیدر آباد کے رہنے والے نہیں تھے مگر ان کی عمر کا بیشتر حصہ وہیں گذرا اور تالیف و تصنیف کا کام بھی انہوں نے وہیں سرانجام دیا۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے خصوصاً مذہبِ اسلام پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ اُن کی بیشتر تصانیف اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ذیل میں اُن کے ایک رسالہ "تحقیق مسئلہ تعددِ زوجات" کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ یہ اڑتالیس صفحات کا

---

[1] "آئینِ اکبری" طبع دہلی ۱۲۷۲ھ جلد اول صفحہ ۲۰ [2] "النقود الاسلامیہ" صفحہ ۱۷ و ۱۸

ایک مختصر سا رسالہ جو کئی مختلف رسائل کے ساتھ ایک ہی جلد میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس میں مولوی چراغ علی مرحوم نے مولوی محمد حسین بٹالوی کے ایک مضمون پر تنقید کی ہے جو نکاح و طلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں بعض امور کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یوریپین علماء کے اعتراضات کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔

"مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی نے رسالہ "اشاعۃ السنہ" میں بعض مسائل نکاح و طلاق مروجہ اہل اسلام کے متعلق چند اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ہر اعتراض کا جواب بہت تفصیل سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے (ملاحظہ ہو رسالہ "اشاعۃ السنہ" جلد ۱۰ نمبر ۵ صفحہ ۱۴۹)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ جواب بہت سے ناواقف مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی ہدایت و ارشاد و ازدیاد معلومات و رفع اعتراضات کے لئے از بس مفید ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے فقہا مولوی صاحب موصوف کے بعض ترقی نما خیالات پر کچھ نہ کچھ ضرور قیل و قال کریں گے اور ان کو اپنے عندیہ کے موافق نشانۂ ملامت بنائیں گے مگر میرے نزدیک مولوی صاحب کے ایسے خیالات قابل اعتراضات نہیں ہیں اس لئے میں صرف بعض بعض مقامات پر چند ریمارک کرنا مناسب خیال کرتے ہوں ......[1]"

دیگر نثر نگار یہ وہ چند نثر نگار ہیں جو مشہور و معروف اور قابل ذکر ہیں مگر ان کے علاوہ کچھ اور نثر نگار بھی ہیں اور ان کی بھی علمی و ادبی خدمات کچھ نہ کچھ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر عدم گنجائش

---

[1] "تحقیق مسئلہ تعدد زوجات" صفحہ ۱۴۲، ۲۴۰

کی بنا پر صرف اُن کے اِسم ہائے گرامی درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

مولوی قادر علی جنھوں نے "مصباح الصلوٰۃ" نامی عربی کی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ عماد الملک نواب سید حسین جنھوں نے رسالہ "مخزن الفوائد" جاری کیا تھا۔ مولوی غلام مصطفیٰ ذہین، مولوی محب حسین، عظمت اللہ خاں مولوی جمال الدین نوری، مولوی انوار اللہ خاں، مولوی سید اشرف شمسی مرزا مہدی خاں کوکب، مولوی مرتضیٰ، مولوی سید خورشید علی اور مانک راؤ وٹھل۔

موجودہ عہد کے نثر نگار

موجودہ عہد کے نثر نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ مگر ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کے نام درج نہ کیے جائیں تو یہ کتاب نامکمل رہ جائے گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نثر کے ہر شعبہ میں قابل ذکر اور قابلِ قدر کتابیں لکھی ہیں سیاست پر بھی تاریخ پر بھی سیرت پر بھی مذہب پر بھی ادب پر بھی تنقید پر بھی، صنعت و حرفت اور سائنس پر بھی۔ ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں۔ علی اصغر بلگرامی، سراج الدین طالب، سید احمد اللہ قادری، تمکین کاظمی، تسکین عابدی، ناکارہ حیدر آبادی، سید بادشاہ حسین، عبد الغفار عبد الرزاق بسمل، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، عبد القادر سروری، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر حکیم اللہ۔ مولوی محمد غوث، جے شنکر راؤ، سید محمد ام اے اور ابراہیم جلیس۔

ان میں سے ابراہیم جلیس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اُن کی طنزیہ اور مزاح نگاری اُردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہے اور صرف حیدرآباد یا جنوبی ہند کی ہی نہیں بلکہ جب غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ نثر اردو لکھی جائے گی تو جلیس کے نام سے ایک علیحدہ باب قائم کیا جائے گا۔

جلیس بہت بیباک لکھنے والے ہیں اُن کی طنز کے نشتر زہر میں بجھے ہوئے ہوتے ہیں جنھیں برداشت کرنا بہت دل گردے کا کام ہے۔ وہ اپنی حق گوئی و بیباکی کے جرم میں کئی بار جیل بھی جا چکے ہیں۔ مگر اُن کی روش میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔ اُن کی تحریروں کے کئی مجموعے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ غمِ دوراں غمِ جاناں، کالا چور، چالیس کروڑ بھارتی، تکونا دیس اور مینفٹی ریزر۔

صحافت دکن میں اُردو صحافت کا آغاز ۱۲۹۸ھ میں ہوا اور "معلم شفیق" کے نام سے مولوی محب حسین نے ایک ماہانہ رسالہ شائع کیا۔ اسی سال ایک اور ماہنامہ "ادیب" جاری ہوا۔ ۱۳۰۰ھ سے ہفت روزہ صحافت کا اجرا ہوا اور "شوکت الاسلام" کے نام سے حاجی محمد کرنان نے ایک ہفت روزہ پرچہ شائع کیا۔ ۱۳۰۱ھ میں مشہور ہفت روزہ "اخبارِ آصفی" کا اجرا ہوا سید محمد سلطان اس کے ایڈیٹر تھے۔ اسی سال یعنی ۱۳۰۱ھ میں دکن کی صحافت نے ترقی کی طرف ایک قدم اور بڑھایا اور "ہزار داستان" کے نام سے مولوی محمد سلطان عاقل کی زیر ادارت ایک روزنامہ اخبار جاری ہوا۔

اس کے بعد دکن کی اُردو صحافت ارتقائی راستے پر گامزن ہو گئی۔ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اُردو" میں اُن اخبارات و رسائل کی سن وار فہرست درج کی ہے جو ابتدا سے تالیف کتاب کے زمانے تک دکن میں شائع ہوئے اس فہرست سے استفادہ کرتے ہوئے ذیل میں مشہور اخبارات و رسائل کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ اور اُن کی کتاب شائع ہونے کے بعد جو رسائل و اخبارات جاری ہوئے ان کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ماہنامے

فنون ۱۲۹۹ھ میں مولوی مشتاق احمد کی زیرِ ادارت جاری ہوا۔

رفیق دکن۔ ۱۳۰۱ھ میں مولوی محمد عزیز الدین کی زیر ادارت جاری ہوا۔
افسر۔ ۱۳۱۴ھ میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق " "
دلگداز۔ ۱۳۱۴ھ میں مولوی عبد الحلیم شررؔ " "
دبدبۂ آصفی۔ ۱۳۱۵ھ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار " "
نسیم دکن۔ ۱۳۱۹ھ میں مولوی نادر علی برتر " "
افسانہ۔ ۱۳۲۱ھ میں مولانا ظفر علی خاں " "
دکن ریویو۔ ۱۳۲۱ھ میں " " "
صحیفہ۔ ۱۳۲۲ھ میں سید رضی الدین حسن کیفی " "
ذخیرہ۔ ۱۳۲۴ھ میں سید ناظر الحسن ہوش کی " "
گجر۔ ۱۳۷۴ھ میں سری نواس لاہوٹی " " "
سویرا۔ ۱۳۷۴ھ میں غلام غوث " " "
صہبا۔ ۱۳۷۴ھ میں سلیمان اریب " " "
ان چند رسائل کے علاوہ "مجلۂ عثمانیہ" انجمن ترقی اردو کا "سہ ماہی اردو" اور "سب رس" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ہفت روزہ

دکن پنچ۔ ۱۳۰۴ھ میں .... کی زیر ادارت جاری ہوا۔
جام جمشید۔ ۱۳۱۶ھ میں ابراہیم خاں " " "
عزیز الاخبار۔ ۱۳۲۰ھ میں نواب عزیز جنگ " " "
محبوب گزٹ۔ ۱۳۲۳ھ میں منشی پیارے لال " " "
عثمان گزٹ۔ ۱۳۳۰ھ میں محمد علی خاں ناظم " " "

روزنامے۔

سفیر دکن۔ ۱۳۰۵ھ میں مولوی سید امجد علی اشہری "
مشیر دکن۔ ۱۲۱۷ھ میں کشن راؤ " "
معارف۔ ۱۳۲۹ھ میں مولوی عبدالباسط " "

تصنیفی ادارے حیدرآباد میں اُردو کی ترویج و اشاعت میں مختلف تصنیفی اداروں اور مطابع کو بہت بڑا دخل ہے۔ ان اداروں میں "انجمن ترقی اُردو" کی حیثیت نمایاں ہے۔ اس انجمن کا قیام ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ کو عمل میں آیا۔ مولانا شبلی اس کے سب سے پہلے سکریٹری تھے۔

" اور آج کل قاضی عبدالغفار اس کے معتمد ہیں۔ اس انجمن نے اُردو کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے بیسیوں قابل قدر کتابوں کے ترجمے ہوئے مختلف علوم و فنون پر بیش بہا کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اور ہمارے کلاسیکی ادب کے سرمایہ کو جو تقریباً فراموش ہو چکا تھا دوبارہ زندگی دی۔

" سلسلۂ آصفیہ" دائرۃ المعارف" دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی" اور" ادارہ ادبیات اُردو" کا قیام بھی تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب کے حق میں بھی نہایت حیات آفریں ثابت ہوا۔ اور ان اداروں نے بھی مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے اُردو کا دامن مالامال کیا۔

حیدرآباد میں اُردو زبان کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ اگست ۱۹۱۹ء مطابق ذالحجہ ۱۳۳۷ھ میں اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اُردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کی حصول کا ذریعہ بنایا جائے اور طلبہ کو مشرقی و مغربی دونوں زبانوں اور اُن کے مفید علوم سے استفادہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے

ساتھ ساتھ اُن میں اِسلامی روح بھی پیدا کی جائے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں حسرتؔ شیروانی نے وائس چانسلر کی حیثیت سے اس یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس یونیورسٹی نے حیرت انگیز ترقی کی اس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ نے زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو نے ثابت کر دیا ... کہ یہ غلط ہے کہ اس میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

خواتین کی ادبی خدمات

شاعرات:۔ جنوبی ہند کی خواتین نے بھی اُردو کی ترقی میں اپنی بساط کے مطابق حصّہ لیا ہے۔ چنانچہ نظم و نثر دونوں میدانوں میں ان کی کوششوں کے نقوش ثبت ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش تو نہیں ہے کہ بالتفصیل ہر ادیب یا شاعر خاتون کے علمی ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی جائے مگر چند نام ایسے ہیں جن کا ذکر کئے بغیر یہ موضوع تشنہ رہ جائے گا۔

شاعرات میں نوشابہ خاتون، صغرا بیگم حیاؔ، جمال النساء بیگم سلمیٰؔ، بشیر النساء بیگم، صفیہ بیگم قمرؔ، امتہ الکریم خورشید نذیرؔ، سیدہ اخترؔ حیدرآبادی اور زہرہ نگاہ (گذشتہ صفحات میں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے کلام کی پختگی اور اس کی شاعرانہ خوبیاں قابلِ تعریف ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

فرشِ زمیں زمردیں، نیلگوں چترِ آسماں　　موجِ ہوا ہے عنبریں، قطعہ سارا بوستاں

قلعہ کوہسار برف
منظرِ پُر بہار برف
کیوں نہ ہو آبدار برف
یاں ہے گہر نثار برف　　(نوشابہ)

منصور بھی تھا تو ہی اور دار بھی تھا تو ہی　　ناحق وہ بندۂ حق بدنام کو بکو ہے
جان جاتی ہے چلی جائے بلا سے مجھ کو کیا　　آبرو میری جو چشمِ ناز قاتل میں رہے
(بشیر النساء بیگم)

عورت

تاریخ کو الٹو مرے عادات کو دیکھو　　ماضی کا سبق پڑھ کے ارادات کو دیکھو
طوفانِ حوادث میں مہمات کو دیکھو　　اور باغ جہاں میں مرے ثمرات کو دیکھو
میں قافلے والوں کے لئے بانگِ درا ہوں

نثر نگار:— خواتینِ دکن نے نظم کے ساتھ نثر کی طرف بھی توجہ کی اور ان میں سے بعض نے خاصی شہرت اور ناموری حاصل کی۔ کچھ خواتین نے نہایت قابلِ قدر اور قیمتی کتابیں تصنیف کیں۔ نہایت معلومات افزا اور اچھوتے مضامین لکھے۔ ان میں سے قابلِ ذکر خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) صغرا بیگم حیا۔ حیدرآباد کی پہلی ناول نگار خاتون ہیں۔ اکثر اخلاقی ناول لکھے ہیں۔ "ہاجرہ کی سرگذشت" اور "موہنی" ان کے اچھے ناول ہیں۔

(۲) جہاں بانو نقوی۔ جامعہ عثمانیہ کی ایم اے ہیں۔ اور زنانہ کالج میں اردو کی معلمہ ہیں۔ ۷، ۸ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ امورِ خانہ داری اور بچوں کی کتابوں کے علاوہ "رفتارِ خیال" کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ترجمے بھی کرتی ہیں اور طبع زاد بھی لکھتی ہیں۔ ان کے یہاں ہلکا ہلکا طنز بھی ہوتا ہے۔ موضوع اکثر و بیشتر سماجی ہوتا ہے۔

(۳) زینت ساجدہ ایم اے۔ یہ بھی جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل ہیں اور زنانہ کالج میں پروفیسر ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ "جل ترنگ" شائع ہو چکا ہے۔ حیدرآباد کی بہت اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ہندو پاکستان کے معیاری جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔ ساجدہ کے افسانے

عریانی اور فحاشی سے پاک ہوتے ہیں۔ ان میں رومان ہوتا ہے، مگر حدود کے اندر۔ انھیں کردار نگاری کا خاص سلیقہ ہے۔ اسلوب نہایت دلکش ہوتا ہے۔

رفیعہ سلطانہ۔ یہ بھی حیدر آباد کی اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "کچے دھاگے" شائع ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ حفیظ جمال بیگم، رابعہ بیگم، بیگم عبدالقادر سروری، امتہ الکریم خورشید نذیر، بیگم ابوالمنصور، اعجاز بیگم، بیگم یوسف مرزا، عائشہ بیگم، خالدہ بیگم مخدوم، عابدہ خاتون، سلطانہ عزیز، رضیہ بیگم، خدیجہ بیگم، عزیزالنساء بیگم اور جیلانی بانو بھی حیدرآباد کی قابل ذکر نثر نگار خواتین ہیں۔ ان میں سے خدیجہ بیگم ڈراما نگار بھی ہیں۔ اکثر ڈرامے بچوں کے لئے لکھے ہیں جن میں سے "دسترت"، "گوتم" "چاند بی بی"، "شاہ جہاں" اور "ملک عنبر" بہت مقبول ہوئے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین[1]

جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ناممکن ہے کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا ذکر نہ کیا جائے۔

اس مشہور ادبی انجمن کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں مسز سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، مولوی عبدالحق، اختر حسین رائے پوری، مخدوم محی الدین اور سید سبط حسن کے ہاتھوں حیدر آباد میں رکھی گئی۔ اس کا پہلا اجلاس مسز سروجنی نائیڈو کی زیرِ صدارت انہیں کے دولت کدے پر منعقد ہوا۔ ابتدا میں اس

---

[1] یہ معلومات مجھے اس وقت حاصل ہوئی جب کتابت ختم ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ترتیب کے مطابق یہ وہاں نہ آسکی۔ جو اس کا مقام تھا۔ (پیام)

کے اجلاس مہینہ میں ایک یا دو بار ہوتے رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے جلسوں کے انعقاد میں باقاعدگی پیدا ہو گئی۔ اور ۱۹۳۹ء میں اس انجمن نے نئے عزائم اور نئے دلولوں کے ساتھ ٹھوس بنیادوں پر آگے کی طرف قدم بڑھایا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے پاس ایک افادی اور مقصدی پروگرام تھا۔ مخدوم، سبطِ حسن، ابراہیم جلیس، سکندر علی وجد، نظر حیدر آبادی، سلیمان اریب اور مسلم ضیائی جیسے مخلص اور ذہین فن کار اس کے وابستگان میں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر آباد میں نئے لکھنے والوں میں ادب کا صحت مندانہ شعور پیدا ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس انجمن کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔

۱۹۴۳ء میں انجمن کے اراکین نے آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کا اجلاس منعقد کیا۔ جس میں مولانا حسرت موہانی۔ پروفیسر فراق گورکھپوری۔ ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، کرشن چندر اور پروفیسر احتشام حسین نے ...... بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ حیدر آباد کی انجمن کا منعقد کردہ یہ اجلاس بے حد کامیاب اور عظیم الشان تھا جس نے انجمن کے وقار کو بہت بلند کر دیا اور حیدر آباد کے علم دوست طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

آج بھی یہ انجمن اپنے کام میں مصروف ہے اور حیدر آباد کی سرزمین سے نئے نئے لکھنے والے پیدا کر رہی ہے۔ جو علم و ادب میں بیش از بیش اضافے کر رہے ہیں۔ [۱]

---

[۱] اس معلومات کے لئے میں اپنے محترم دوست جناب سید سبط حسن صاحب کا سپاس گذار ہوں۔ (پیام)

دورِ حاضرہ کے جرائد

کتاب کی ترتیب کے بعد مجھے ذیل کی معلومات کا بیشتر حصہ اپنے فاضل دوست جناب حبیب اللہ اوج ایڈیٹر انچارج روزنامہ نوائے وقت لاہور سے حاصل ہوا۔ اس لئے موصوف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اسے کتاب کے آخر میں شامل کیا جا رہا ہے، ورنہ اس کا اصل مقام وہیں تھا جہاں دکن میں اُردو صحافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ (پیام شاہجہانپوری)

روزانہ اخبارات

نام اخبار	مدیر	کیفیت
صحیفہ	مولوی اکبر علی	
رہبرِ دکن	سید وحید الدین محمود	
رہنمائے دکن	احمد عارف	
حمایتِ دکن	حمایت علی	
تنظیم	علی اشرف	
امروز	شعیب اللہ خاں	(جولائی ۴۸ء میں ایڈیٹر کے قتل کے بعد بند ہو گیا
سیاست	عابد علی خاں	
پیامِ جدید	قاضی عبد الغفار	بھی اس کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں
نظام گزٹ	وقار احمد	
وقت	عبد الرحمٰن رئیس	(۴۸ء کے اواخر میں بند ہو گیا)
میزان	حبیب اللہ اوج	(اوج صاحب کے ورود لاہور کے ساتھ ہی بند ہو گیا
منزل	اظہر حسین رضوی	(۵۰ء کے اواخر میں بند ہو گیا)
جناح	......	(۴۸ء کے اواخر میں بند ہو گیا)
ملاپ	....	یہ روزنامہ تقسیم کے بعد حیدرآباد سے بھی شائع ہونے لگا ہے۔

[ب] جرائد ہفت روزہ رسائل

راز	مولوی احمد اللہ روحی	
پرچم	فصیح الدین	(تقسیم کے بعد بند ہوگیا)
رعیت	نرسنگ راؤ	(بند ہوگیا)
واعظ	مولوی عبدالوہاب عندلیب	

ماہانہ جرائد

شہاب	عبدالرزاق بسمل	
سب رس	ڈاکٹر زور	
ایوان	کرمانی	(بند ہوگیا)
رباب	......	(بند ہوگیا)
تاریخ	سید شمس اللہ قادری	(بند ہوگیا)
ہندوستانی	غلام محمد خاں	
نورس	......	یہ پرچہ ۱۹۲۹ء میں جاری ہوا تھا۔

تبصرہ ان اخبارات ورسائل سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کی صحافت روز بروز ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبارات اپنی خبروں کی صحت، اُن کی ترتیب، گٹ اپ اور تعمیری اداریوں کی وجہ سے امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ہفت روزہ اور ماہانہ جرائد کا معیار بھی بہت بلند ہے۔ ہفت روزہ پرچے علم وادب اور سیاست کا نہایت عمدہ امتزاج ہوتے ہیں۔ دلچسپ اور معلوماتی مضامین، شگفتہ غزلیں اور حیات پرور نظمیں انکے کالموں کی زینت ہوتی ہیں۔ ماہنامہ جرائد نے تو جنوبی ہند کی صحافت میں سب سے اونچا مقام حاصل کرلیا ہے۔ جس سرزمین سے "سب رس" اور "تاریخ" جیسے معیاری پرچے شائع ہوتے ہوں وہاں کی علمی وادبی اور صحافتی ترقی کی تعریف وتعارف کی محتاج نہیں۔